

# بچے کی تربیت

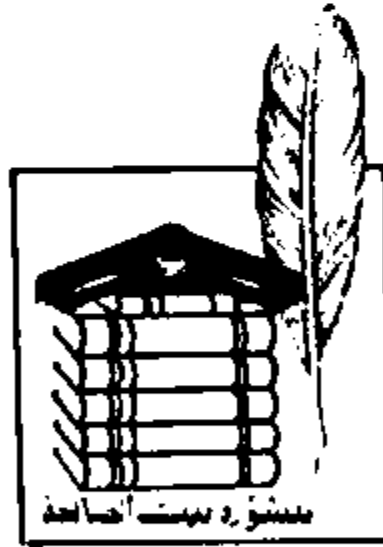
ابن فرید



# بچے کی تربیت

ابن فرید

منشورۃ بیت الصالحہ  
زمینہ عنایت خاں رام پور ۲۴۲۹۰۱



### جملہ حقوق محفوظ ہیں

پہلا ایڈیشن : ۶۱۹۵۵ کتابت: راحت علی خاں  
بیسواں ایڈیشن (بہتریم و اضافہ): ۶۱۹۹۳ پرنس: فائن آرٹ ڈیزائنرز، دہلی  
تعداد اشاعت: ۲۲۰۰ قیمت: پینتالیس روپے  
ناشر: منشورہ بیت الصالحہ - زینہ عنایت خاں - رام پور - ۲۲۲۹۰۱  
پرودکشن: اہل قلم نئی دہلی ۲۵ جون ۱۹۹۳ء

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ  
تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں  
(التغابن - ۱۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا  
اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ  
التحریم - ۶

كَلَّمَكُمْ رَاعٍ وَكَلَّمَكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ الْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ  
 عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ  
 رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا وَالْخَادِمُ  
 رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَكَلَّمُوا رَاعٍ وَ  
 مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (متفق عليه)

تم سب اپنی اپنی جگہ پر ذمہ دار ہو۔ خلیفہ ذمہ دار ہے، اُس سے اپنی رعیت کے متعلق  
 پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، ان کے متعلق اُس سے پوچھا جائے گا۔  
 عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے، اُس کے بارے میں اُس سے پوچھا جائے گا۔  
 خادم اپنے اقل کے مال کا ذمہ دار ہے، اُس کے متعلق اُس سے پوچھا جائے گا۔ تم سب  
 ذمہ دار ہو، اپنی رعیت کے متعلق پوچھے جاؤ گے۔

اُن کے نام  
جن کو آئندہ نسل کی  
صالح تعمیر کرنی ہے

# فہرست

۹	○ ابتدائیہ
۱۳	○ نظر ثانی
۱۵	○ تذکرہ
۲۰	○ گھر اور گھرانہ
۲۲	ماں اور بچہ
۲۵	باپ اور بچہ
۲۸	دوسرے گھروالے
۳۲	○ بچے کے ابتدائی سال
۳۳	جسمانی صحت
۳۶	ذہنی صحت
۴۵	○ بچے کی نشوونما
۴۶	جذباتی نشوونما
۴۹	حسی نشوونما
۵۲	بول چال کی نشوونما
۵۸	جنسی نشوونما
۶۶	معاشرتی نشوونما

- ۷۶ ○ بچے کی نئی نئی مشکلات
- ۷۷ دُور دُور چھڑانا
- ۸۲ بستر شراب کرنا
- ۸۶ نشتلانہ اور ہکلاانا
- ۹۶ ○ بچے کی ناشائستہ حرکتیں
- ۹۸ بچے اور سنا
- ۱۰۳ بچوں کی ضد
- ۱۰۶ بچوں میں غصہ
- ۱۱۰ بچوں میں خوف
- ۱۱۶ بچوں میں جھوٹ
- ۱۲۵ ○ بچوں کی الجھنیں
- ۱۲۶ کجرو والدین
- ۱۳۱ دوسرا بچہ۔ بحیثیت شریک
- ۱۳۷ بچے کا ضمیر
- ۱۴۲ معاشرے کی کجرویوں
- ۱۵۳ ○ بچوں کی صالح تعلیم
- ۱۵۷ بچوں کی نصیحتیں
- ۱۶۵ بچوں کی آزادی
- ۱۶۷ بچوں کے کھیل
- ۱۷۵ ابتدائی تعلیم
- ۱۸۸ ○ کردار کی تشکیل
- ۲۰۱ ○ آخری بات



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ابتدائیہ

اس کتاب کی مخاطب نواتین ہیں، کیوں کہ ان ہی کے کندھوں پر بچے کی تربیت کا بار گرا ہے۔ انھیں کو آنے والی نسلوں کے ذہن، سیرت، اخلاق و معاشرت کی تعمیر اس طرح کرنی ہے کہ مستقبل کی دنیا روشن اور پُر امن ہو لیکن یہ امر کس قدر عبرت انگیز ہے کہ ہماری اکثر نواتین اپنی ذمہ داری سے قطعاً نا آشنا ہیں، کیوں کہ ان کے سامنے ان کے مقصد و وجود کو واضح طور پر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ وہ یہ تو جانتی ہیں کہ وہ کسی کی زوجیت میں ہیں اور اس کے گھر کی دیکھ بھال ان پر فرض ہے لیکن وہ اس کا تصور ہی نہیں رکھتیں کہ ان کی یہ خاندانی مصروفیات معاشرہ پر کسی طرح اثر انداز بھی ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ان اعمال سے جو اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ناواقف ہونے کی وجہ سے غافل رہتی ہیں۔

بچے کی تربیت انھیں اعمال میں سے ایک عمل اور اہم ترین عمل ہے جس کی طرف وہ کما حقہ توجہ نہیں دے پاتی ہیں، کیوں کہ وہ اس کے اثرات سے ناواقف ہیں۔

اس کتاب میں بچے کی تربیت کے نفسیاتی پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ موضوع تیار نہیں ہے۔ انگریزی اور اردو میں اس انداز کی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور جو کچھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے دوسری کتابوں میں اس سے بہت کچھ زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کتابوں کے مخاطب مرد ہیں عورتیں نہیں۔ ان میں بات کو اصطلاحات کی پابندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور جہاں کہیں اطلاقی یا عملی نفسیات سے بحث کی گئی ہے وہاں بھی اصطلاحات کی پوری

پوری پابندی کی گئی ہے۔ چنانچہ ہماری ہندوستانی خواتین اور خاص طور سے ایسی خواتین جن کی تعلیم کا معیار میسرے چوتھی جماعت سے زیادہ نہ ہو۔ ان کے لیے مذکورہ کتابوں سے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کتاب میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ زبان کافی حد تک سلیس اور انداز بیان عام فہم رکھا جائے۔ اصطلاحات کا ممکنہ حد تک استعمال نہ کیا جائے اور جو اصطلاحات حسنِ اتفاق سے استعمال ہو جائیں وہ ایسی ہوں کہ ان کے بارے میں کم تعلیم یافتہ خواتین کے ذہن میں مطلوبہ تصور پہلے سے ہو۔

اس التزام ہی کی بنا پر یہ بھی کرنا پڑا ہے کہ کتاب کی ترتیب فنی اعتبار سے نہ کی جائے اور عنوانات بھی مروجہ نفسیاتی کتابوں کے تتبع میں نہ قائم کیے جائیں بلکہ جو معاملات بچے کی تربیت کے سلسلے میں خواتین کے لیے اہم ہوں وہی اس کتاب کے عنوانات قرار پائیں۔ عنوانات کے اس طرح مقرر کرنے سے سب سے بڑی مشکل جو درپیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہی بحث کو کئی جگہ پھیرنا پڑا ہے اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو وہ مخصوص عنوان تشنہ رہ جاتا، لیکن اس تکرار کو گوارا کر لیا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی ایک نکتہ کو دوبارہ بیان کرنا پڑا ہے وہاں مثالوں اور انداز بیان کے ذریعہ متنوع پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی تکرار جس میں متنوع ہو، اس لیے بھی ضروری ہے کہ جس معیار کی خواتین کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کے ذہنوں میں پیش کردہ بات نقش ہو جائے اور وہ اس کی اہمیت سے واقف ہو جائیں۔ یہ طریقہ بیان انوکھا نہیں ہے، اطلاقی اور عملی نفسیات کی اکثر غیر ملکی کتابوں میں یہ خوبی مشترک ہے۔

انگریزی کی تمام اصولی، اطلاقی اور عملی نفسیات کی کتابوں کے پس منظر میں مادہ پرستانہ نقطہ نظر اور ڈارون کا نظریہ ارتقا کارفرما ہے، چنانچہ انسان کی نفسیات پر بحث عالم حیوانی اور جذبات و حشیانہ کو تقدیم دے کر کی گئی ہے۔ ہمارے اردو ماہرین نفسیات نے بھی اس کا من و عن اتباع کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے انسان کو انسانی پیمانہ سے ناپنے کے بجائے وحشی اور بربری پیمانہ سے ناپا ہے۔ اس نقطہ نظر کے بارے میں تقریباً ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ دنیا کے کسی بھی نظریہ سے بڑھ کر قیاسی ہیں۔ دوسرے ان نظریات سے انسان کی زندگی میں جو تیش اور بہیمانہ صفات پیدا ہوتی ہیں وہ دنیا کی تباہی اور بربادی ہی کا پیش خیمہ ہیں۔ عملی اور اطلاقی

نفسیات کی ترجمانی فرائڈ کے نظریات تحلیل نفسی کے ذریعہ بھی کی گئی ہے۔ فرائڈ زندگی کے تمام محرکات کو جنس اور موت کی پیداوار بتاتا ہے۔ اس طرح وہ بچے کے معصوم سے معصوم فعل کو جنسی گردانتا ہے۔ زندگی کے تمام افعال و اعمال کو اگر جنسی عینک سے دیکھا جائے تو اس سے جو سفلی مزاج پیدا ہوگا وہ صرف ہماری آپ کی نگاہ سے ہی پوشیدہ نہیں ہے بلکہ اس کے ہم وطن، ہم معاشرہ، ہم خیال مفکرین کی نگاہ سے بھی پوشیدہ نہیں ہے، خود اس کے شاگرد رشید یونگ نے اس کی مخالفت کی ہے۔

اس کتاب میں ان تمام نقطہ ہائے نظر سے اجتناب کر کے اس حقیقت کو اساس بنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو ایک آدم کی اولاد سے پیدا کیا ہے، اس نے روزِ اول سے ہی انسان کو خلیفۃ الارض بنایا ہے اور وہ اشرف المخلوقات ہے۔ چنانچہ تربیت کے تمام مراحل میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ بچے کے صحیح مقام سے نہ صرف والدین ہی صرف نظر نہ کر سکیں بلکہ بچے کو بھی اس کا پورا پورا احساس رہے۔

بچے کی تربیت کے معاملے میں عملی نفسیات کی کسی بھی کتاب کا مطمح نظر اب تک یہ نہیں رہا ہے اور اس لحاظ سے یہ پہلی کوشش ہے جو خواتین کے ہاتھ میں اور ایسی خواتین کے ہاتھ میں جا رہی ہے جو اب تک شاذ ہی کسی نفسیات کی کتاب سے استفادہ کر سکی ہوں۔

اس کتاب کا مقصد تحریر بچے کی تربیت دینِ فطرت۔ اسلام۔ کے مطابق کرنے کے لیے مشورے دینے کی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسلام کے بارے میں اصولی معلومات نہیں دی گئی ہیں، بلکہ یہ پہلے سے ہی تصور کر لیا گیا ہے کہ قاری نے اسلام کا مطالعہ اس کتاب کے پڑھنے سے پہلے کر لیا ہوگا اور اس کے ذہن نے اسلام کو دینِ حق سمجھ کر قبول کر لیا ہوگا۔

اس کتاب کی تیاری میں میں نے اکثر نفسیات کی انگریزی کتب و رسائل اور اردو کتب و رسائل سے استفادہ کیا ہے۔ ان تمام کے مصنفین میرے شکر یہ اور تہنیت کے مستحق ہیں۔ نہیں جناب عبدالحی صاحب مدیر پندرہ روزہ احسانات اور صاحب مکتبۃ الحسنات کا بھی بے انتہا مشکور ہوں۔ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب اور اس کے اکثر مباحث میں میری اچھی خاصی رہنمائی کی ہے۔ اور اس کتاب کو قسط وار احسانات میں ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ تک شایع کرایا ہے،

اپنی گرفتاری کی وجہ سے وہ مسودے کے بنانے سنوارنے میں میری رہنمائی نہ کر سکے۔ ورنہ انھوں نے پورے مسودے کو کافی توجہ سے پڑھا تھا اور اکثر مقامات پر مفید مشورے دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ خدا کرے مجھے اس کا موقع پھر میسر آئے۔

اس کتاب کے مسودہ کی ترتیب اور بعض اہم مشوروں کے لیے اگر میں اہم صہیب کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ ان کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔

الحسنات میں جیسا کہ سلسلہ شایع ہونا شروع ہوا تو ہندوستان اور پاکستان کے متعدد روزناموں، ہفتے وار اور پندرہ روزہ اخباروں اور ماہناموں نے اسے وہاں سے نقل کر کے شائع کیا۔ میں ان تمام خیر آمد کا بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے میری اس طرح ہمت افزائی کی ہے۔ اور آخر میں ان حضرات کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں گا جو اس کتاب کی فروگذاشتوں سے مجھے مطلع کریں گے تاکہ میں آئندہ ان کی اصلاح کر سکوں۔

ابن فرید

راپور۔ یو۔ پی

یکم مئی ۱۹۵۵ء

## نظرِ ثانی

نقش گری تو جیسی ہونی چاہیے تھی وہ پہلی کوشش میں ہو چکی۔ دوبارہ اس سے زیادہ اور کیا کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ داغ ڈھبے باقی رہ گئے ہوں انھیں دور کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ جو پہلو خام رہ گئے ہوں انھیں سنوارا جائے۔ مگر ایسا کرتے ہوئے بھی بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی تحریر ناقص و خام نظر آئے بھی تو کہاں؟ اس پر نشتر زنی کی جگے تو اپنے جذبہِ رحم کو کیسے سمجھایا جائے؟ یہ وہ دقتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے مصنف کو اپنی تحریر میں داغ ڈھبے نظر نہیں آتے۔ اسی بنا پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے میں نے طبعِ اول کو اپنی نظر سے نہیں آپ کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

سب سے پہلے اس کتاب پر نظرِ ثانی میں نے ۱۹۵۸ء میں کی۔ زبان و بیان کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مختلف مقامات پر حسبِ ضرورت اضافے بھی کیے۔ ایک باب کا عنوان ”بچے کی تربیت کے لیے بنیادی باتیں“ تھا۔ اسے بدل کر ”بچے کی نشوونما“ کر دیا۔ اسی باب میں ایک ذیلی باب ”معاشرتی نشوونما“ کا اضافہ بھی کر دیا۔ ہر باب کے آخر میں تمام مباحث کا خلاصہ ”چند لفظوں میں“ درج کر دیا تاکہ وقتاً فوقتاً ان خلاصوں کو پڑھ کر موضوعات کو ذہن میں تازہ کیا جاسکے۔

دوسری بار ۱۹۷۳ء میں پھر یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کتاب کے متن کی تصحیح کی جائے اور کچھ اہم ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ باب ”بچے کی الجھنیں“ میں ”بچے کا ضمیر“ اور باب ”بچوں کی صالح تعلیم“ میں ”ابتدائی تعلیم“ کا اضافہ کیا گیا۔

اب تیسری بار ۱۹۹۳ء میں باب ”بچے کی الجھنیں“ میں ”معاشرے کی کج رویاں“ کے ذیلی باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۹۵۵ء (بلکہ اصلاً ۱۹۵۳ء) سے اب تک چالیس سال میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے، معاشرہ و ماحول میں اتنا تغیر آچکا ہے، سوچنے کے انداز و اور وسائل زندگی میں اتنی تبدیلیاں و ترقیاں ہو چکی ہیں کہ پہلے جو کچھ مثال کے طور پر پیش کیا گیا تھا وہ اب بڑا اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس عجوبگی کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ ترمیم و اضافے کیے گئے ہیں تاکہ کتاب میں موجودہ عہد سے مطابقت پیدا ہو جائے۔

حدہ کے قیام کے دوران عبدالرشناصح علوان کی تصنیف ”تربیتہ الاولاد فی الاسلام“ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تصنیف دو جلدوں میں ہے اور پہلی بار ۱۹۷۶ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے مخاطب اہل علم حضرات ہیں۔ سیدات اور وہ بھی کم پڑھی لکھی خواتین کے لیے یہی پیش نظر تصنیف ”بچے کی تربیت“ اپنی تمام کیوں کے باوجود یگانا و تنہا ہے۔ اسے اسلامی نفسیات میں بھی اولین کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کی طلب میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ بے شک ساری تعریف اللہ سبحانہ، تعالیٰ کے لیے ہے۔

ابن سرید

۶ مارچ ۱۹۹۳ء

بیت الصالحہ۔ زینہ عنایت خاں

رام پور (یو۔ پی) ۲۴۴۹۰۱

## تذکرہ

دیکھیے کتنا پیارا بچہ ہے یہ! — ذرا اس کی آنکھوں میں توجہ بانک کر دیکھیے۔ کتنی معصومیت کے ساتھ چمک رہی ہیں۔ ان میں کتنی مسرت بھری ہوئی ہے۔ یہ پیاری نیلگوں آنکھیں کتنی اچھی لگتی ہیں۔ اب ذرا اسے گدگدائیے! — آہا، اب تو یہ اور بھی پیارا معلوم ہونے لگا۔ کیسی دل موہ لینے والی ہنسی ہے اس کی۔ اس کے ہونٹ کیسے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح دُمک رہے ہیں! — ذرا اپنے دل سے تو پوچھیے، اس پر کیا بیت رہی ہے؟

کیا آپ نہیں چاہتیں کہ بچے کو بسنے سے لگائیں، اور محبت میں پوری طرح ڈوب کر اس کو بسنے سے چٹالیں؟ آخر یہ آپ ہی کا تو بچہ ہے! — آپ کیوں نہ چاہیں گی؟ — ضرور چاہیں گی، بلکہ بے اختیار ہو کر اسے چوم چوم لیں گی۔ کیلجے سے لگائیں گی اور ہزاروں تمناؤں، دعاؤں اور امیدوں سے آپ کی رُوح تازہ ہو جائے گی۔

لیکن ذرا غور تو کیجیے، میں نے کہیں یہ تو نہیں کہا کہ آپ کا بچہ بد صورت ہے، اس کے رنگ کو بھی کالا نہیں بتایا۔ اس کے کمزور ہونے کا بھی ذکر نہیں کیا، اور پتہ تو یہ ہے کہ میں نے اس کی کسی بھی خامی کا تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ ہو سکتا ہے آپ کے بچے میں کوئی خامی نہ ہو۔ وہ جسمانی طور پر بالکل درست ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، اس کو کوئی بیماری ہو، یا ایسی ہی کوئی اور بات ہو، — مگر اس سے آپ کی محبت میں تو کوئی کمی نہیں آتی۔ آپ اس کو ہر صورت میں چاہیں گی، آخر آپ ہی کا تو بچہ ہے۔ وہ خواہ کیسا ہی ہو آپ ہی کا تو جگر گوشہ ہے۔

پھر آپ اس کو کیسے نہ چاہیں گی۔

اور حقیقتاً آپ اسے ضرور چاہیے، کیونکہ یہ آپ کا حق ہے۔ آپ کے لئے اللہ کی طرف سے نعمت ہے، ایک عطیہ ہے جس کو آپ نے کتنی ہی مصیبتوں اور پریشانیوں کو تحمل کر حاصل کیا ہے۔ اسی لئے آپ کی محبت جائز ہے۔ کیوں کہ ہم کو، آپ کو، ہر شخص کو وہ چیز زیادہ عزیز ہوتی ہے جس کے حاصل کرنے میں ہم کو کچھ نہ کچھ وقت پیش آئے۔ بالکل اس طرح جیسے ریت اور مٹی کو حاصل کرنے میں ہم کو زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی، اور سوتا چاندی یا بیسے جو اہرات ہیں یوں ہی نہیں مل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ریت اور مٹی کے مقابلے میں ان کی بچوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

لیکن کیا آپ اس کے لئے تیار ہوں گی کہ ان بیش بہا چیزوں کو کسی اندھے کنویں میں پھینک دیں؟ جی ہاں حقیقتاً یہ پوچھنا تو حماقت ہے! اور اسی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے اس پیارے بچے کو بھی آگ میں جھونکنا کیا۔ اس کو اس کی آنج بھی نہ لگنے دیں گی۔ جی، اس وقت تو واقعی میں عجب الٹی الٹی سی ہی باتیں کر رہا ہوں! — خیر چلنے دیجیے۔ میں آپ سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ کچھ غور کرنے کی بات ہے، اس لئے مجھے کچھ ایسی مثالوں کو سامنے لانا پڑا، جن کو آپ کم عقلی کی بات کہنے کے لئے مجبور ہو گئیں۔

بات یہ ہے کہ یہ بچہ جو آپ کی گود میں ہمک رہا ہے، اسے آپ جانتی ہیں کہ یہ آپ کا چراغ ہے، اور آپ کے بعد دنیا میں یہ آپ کا نام لیوا رہے گا۔ اسی سے آپ کی نسل چلے گی۔ یہی زمانے کے لئے یادگار ہوگا۔ گویا یہ آپ کی پونجی ہے، آپ کی دولت ہے۔ آپ کو اسے مصرف میں لانا ہے۔ اور یہ مصرف کیا ہے؟

شاید اس سے بڑھ کر نہیں کہ آپ کو سکھ اور آرام پہنچائے، اور جس طرح آپ کا مطمح ہے اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ ہو۔ اچھائیوں کو پھیلانے، بُرائیوں کو نیست و نابود کرے۔ اپنے عزیزوں، پڑوسیوں اور ملنے جھلنے والوں کے لئے باعثِ رحمت ہو۔ غرض، آپ کبھی یہ نہ چاہیں گی کہ یہ زمین کی پیٹھ پر پھوڑا بن کر رہے اور آنے والی نسلیں آپ کو بُرے ناموں سے یاد رکھیں اور یہ بھی آپ پسند نہ کریں گی کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اُسے گنہ گاروں کے گروہ میں



رکھے اور پھر اس کی غلط پرورش کی ذمہ داری کی بنا پر آپ کو بھی اسی عذاب میں شریک ٹھہرانے۔

اصل میں اگر ہم آپ یہ نہیں سوچ لیتیں کہ ہماری آپ کی زندگی کا مصروف کیا ہے تو ہمارے لئے یہ بڑا مشکل ہو جائے گا کہ ہم اپنی زندگی، اس گتھی کو سلجھائے بغیر گزار لے جائیں کہ ہمیں کس طرح زندہ رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے ہی تو پیدا کیا ہے کہ انسان زمین پر اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، اس کی بندگی کرے اور اس راہ میں اپنی کسی بھی چیز کو عزیز نہ سمجھے۔ حتیٰ کہ جان تک سے بھی اتنی محبت نہ رکھے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سوچ لے کہ زندگی کا کیا ہے؟ چاہے جیسے کٹ جائے اچھی یا بُری، تو بھلا بتلائیے کہ وہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو کیوں کر افضل سمجھے گا؟ وہ تو بس ہر کام اسی بے توجہی سے کر گزرے گا اور بہت ممکن ہے کہ وہ ایسے کام بھی کرنے میں نہ جھجکے جو محض وقتی تسلی کے سوا اسے اور کچھ بھی نہ دے سکیں، بلکہ شاید اس کے حق میں سیکڑوں بُرائیوں کا اضافہ کر جائیں۔ اب یہی دیکھیے جو لوگ چوری کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دوسروں کو بلا تصور قتل کر ڈالتے ہیں، بڑا کھلتے ہیں، شراب پیتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں اور ایسے ہی نہ معلوم کتنے فحش اور ذلیل کام کرتے ہیں، وہ ایسے ہی لوگ تو ہوتے ہیں جو اپنی ذمہ داری نہیں محسوس کرتے اور نتیجہ میں نہ معلوم کتنی ہی بُرائیاں، اس دنیا کے اندر پھیلا دیتے ہیں، ان کا حشر اللہ تعالیٰ کے حضور میں کیا ہوگا؟ — ذرا آپ ہی اپنے ذہن پر زور ڈال کر فیصلہ کیجیے — کہیے ان کو عذاب ہی تو بے گناہ؟ — اور یہ کتنا سخت ہوگا؟

اگر ہم یہ سوچ لیں تو شاید ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے کہ ہمیں زندگی کیوں کر گزارنی چاہیے اور جو کچھ ہم اپنے لئے پسند کریں گے وہی اپنی اولاد کے لئے بھی پسند کریں گے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ خراب زندگی گزارنے میں ہمارا نقصان ہے تو ہم اپنے بچے کو بھی ایسی زندگی گزارنے نہ دیں گے۔

مگر مجھے آپ سے شکایت کرنی ہے — کیا ہے؟ — وہ بھی سن لیجیے؛ بہت سی مائیں تو اپنے بچوں کے لئے وہی پسند کرتی ہیں جو اپنے لئے پسند نہیں کرتیں۔

بالکل ایسے ہی جیسے بہت سخی لوگ اپنا سٹرا بسا کھانا فقیروں کو دے کر ثواب کمانا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ مائیں اپنے بچوں کی زندگی کی طرف سے بے پروا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ زندگی اتنی ہی خراب ہو جاتی ہے جتنا کہ سٹرا بسا کھانا، اور یہ بچے بڑے ہو کر زمین کی ٹیٹھ پر پھوڑا بن کر رہتے ہیں اور پھر بعد میں وہ کہتی ہیں "میں کیا کروں" یہ تو میری قسمت کا پھیر ہے" قسمت سے کون انکار کرتا ہے؟ لیکن ذرا یہ تو سوچیے کہ قسمت کو بگاڑنے کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی ہے؟

دیکھیے، ایک مثال سے میں یہی بات سمجھانے کی کوشش کروں گا:

آپ جب سل پر مختلف قسم کے مسالے بیستی ہیں تو کچھ سالہ ادھر ادھر بھی بکھر جاتا ہے، اور چوں کہ سل کے پاس نمی رہتی ہے اس لئے اکثر چیزیں اُگ بھی آتی ہیں جیسے دھنیا وغیرہ۔ اب فرض کیجیے کہ آپ کی سل کے پاس ایک ڈھنپے کا پودا اُگ آیا۔ آپ اس کو اُگنے دیں، دو تین دنوں میں وہ کچھ بڑا ہو جائے گا۔ اب آپ اس پودے پر ہلکا سا وزن رکھ دیں اور کچھ دن رکھا رہنے دیں، پھر وزن ہٹا دیں، دیکھیے پودا ٹیڑھا ہو گیا۔ آپ اس کو سیدھا کرنا چاہیں گی تو ٹوٹ جائے گا۔ بتائیے یہ پودا کیوں ٹیڑھا ہو گیا؟

بالکل اسی طرح یہ مائیں اپنے بچوں کی زندگیوں میں ٹیڑھ پیدا کر دیتی ہیں اور پھر قسمت کو کوستی ہیں۔ بچہ اس دنیا میں بڑا صاف اور سادہ ذہن لے کر آتا ہے۔ اس کے لئے یہاں کی ہر چیز عجیب ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر چیز کو چکھ کر آزما تا ہے۔ کسی چیز کو پکھا کر آزما تا ہے۔ کسی چیز کو پیٹھ کر اور توڑ کر آزما تا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ — یہ کیوں اس کے چاروں طرف عجب عجب چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے؟ بچوں وہ بہت سی چیزوں کو جان جاتا ہے۔ آپ کو بھی پہچان جاتا ہے، اور پھر وہ آپ کو طرح طرح کی چیزوں کو مختلف طریقوں سے بُرتے، موئے دیکھتا ہے، اور خود بھی آپ کی نقل کرنے لگتا ہے۔ وہ بہت سی چیزیں آپ کے ہی ذریعے دیکھتا ہے۔ مثلاً بات کرنا، چیزوں کو ادھر ادھر رکھنا، چلنا پھرنا وغیرہ وغیرہ۔ اب دیکھیے، جیسے آپ کے طور طریقے، ہوں گے ویسے ہی آپ کا بچہ بھی ان کی نقل کرے گا اور ان کو اپنائے گا۔ اگر آپ کی تیوریاں ہر وقت جڑھی رہیں گی تو بچے کے ملتے

پر بھی شکین پڑ جائیں گی۔ اگر آپ بلاوجہ لوگوں میں عیب نکالتی رہیں گی تو وہ بھی بدخلق ہو جائے گا۔ اگر آپ خود اسے پھڑک دیا کریں گی تو وہ بھی ایسا ہی رویہ اختیار کرے گا۔ برخلاف اس کے اگر آپ فراخ دل اور شکفہ مزاج رہیں گی تو وہ بھی ویسا ہی بنے گا۔ اگر آپ عالی ہمت ہیں تو وہ بھی اسی طریقے کو اپنائے گا۔ غرض کہ وہ بہت کچھ ویسا ہی ہو گا جیسی آپ ہوں گی۔

یہ مقولہ اسی وجہ سے بالکل درست ہے کہ ماں کی گود پہلا مدرسہ ہے! اس مدرسے میں اس کو جیسی تعلیم ملے گی وہ ویسا ہی بن کر نکلے گا! اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو گھر کی مالکہ قرار دیا ہے۔ اگر آپ چاہیں گی کہ آپ کی گود سے صالح ہستی ابھرے تو اللہ تعالیٰ آپ کی آرزو کو پسند فرمائے گا اور بہت ممکن ہے کہ آپ کو کامیاب بھی کر دے۔ لیکن اگر آپ اس ہستی کی طرف سے بے پروا ہو جائیں گی، یعنی اپنی دولت، اپنی پونجی کو کسی بھی مضرت میں لانا نہ چاہیں گی تو اللہ تعالیٰ آپ سے حساب لے گا۔ آپ اس وقت کیا جواب دیں گی اور پھر دنیا میں آپ کو کیا آرام مل جائے گا؟۔ یہاں بھی تو اسی عذاب کا سامنا کرنا ہو گا۔

اور پھر اگر آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے پروا ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ بھی کیا ایسا نہ کرے گا؟ بس! بس!۔ بس اسی وجہ سے آئیے ہم اس بات پر غور کریں کہ یہ بچہ جسے آپ اتنی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں اسے کیوں کر صالح فرد بن کر رہنا سکھایا جائے! اور اسے کیوں کر قدم قدم پر بچایا جائے کہ اس میں ٹیڑھ نہ آئے۔ یہ اپنے اللہ کا مطیع و فرمان بردار ہو، آپ کے لئے سہارا ہو، دنیا والوں کے لئے باعثِ عزت ہو، عالی ہمت ہو، حوصلہ مند ہو، خوش دل ہو اور لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے جگہ ہو! اور ایسی ہی بہت سی نیکیاں اس میں رچ بس جائیں۔

آئیے غور کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس مہم میں کامیاب کرے:

## چند لفظوں میں

- بچہ پیدائشی طور پر سیرت و کردار کی خرابیاں لے کر پیدا نہیں ہوتا اور نہ یہ قسمت کی خرابی ہے۔
- آگے چل کر وہ کیا بنے گا؟۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ آپ سے کیا سیکھتا ہے۔

## گھر اور گھرانا

کیا آپ نے یہ کبھی نہیں سنا کہ اس لڑکے نے گھر والوں کی ناک کٹوا دی ؟  
 اور کیا آپ نے یہ بھی نہیں سنا کہ اس لڑکے نے گھرانے کا نام روشن کر دیا ؟  
 یہ تو آئے دن کے تذکرے ہیں۔ جب بھی آپ پاس پڑوس کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر دنیا  
 جہان کی باتوں میں لگ جاتی ہوں گی تو کبھی نہ کبھی ایسا فقرہ ضرور آپ کے مُسنے میں آتا ہوگا۔ لیکن اس  
 وقت باتوں میں کھوئی ہوئی عورتیں اپنی ہی بات پر غور نہیں کرتیں۔۔۔ آخر ایسا بھی کیا  
 ہے کہ محض ایک لڑکے کی وجہ سے خاندان بدنام ہو جائے یا عزت کا مرتبہ حاصل کر لے ؟  
 ذرا غور تو کیجیے۔۔۔ کیا ایک لڑکے کی وجہ سے ایسا ہو سکتا ہے ؟ بات تو بڑی عجیب  
 سی ہے، لیکن ہوتا ایسا ہی ہے۔

بچے سب سے پہلے دنیا کے جس حصے سے واقف ہوتا ہے وہ اس کا اپنا خاندان ہے،  
 اپنا گھر ہے۔ یہ تو ہر حالت میں ہی ہوگا کہ وہ کسی ایک جگہ پیدا ہو۔ اس جگہ کچھ رہنے بسنے والے  
 ہوں۔ یہ رہنے بسنے والے اس کے خاندان کے لوگ ہوں گے جو بار بار اس کی نگاہوں کے  
 سامنے آتے رہیں گے۔ وہ تقریباً ہر وقت اس کو اپنی اپنی گود میں لیں گے۔ اسے کھلائیں گے، اُسے  
 اشارے کریں گے، اس کو دیکھ کر خوش ہوں گے، اور اسی طرح ہر موقع پر اس کے ساتھ پیش  
 آئیں گے، وہ ان کی حرکتوں کو دنیا میں پہلی مرتبہ دیکھے گا، پھر روز دیکھے گا، دن میں کئی کئی بار  
 دیکھے گا۔ یہاں تک کہ وہ سمجھنے لگے گا کہ اسے بھی ایسی ہی حرکتیں کرنی چاہئیں۔ پس وہ ان کو  
 دیکھنے لگے گا۔

میں نے ایک چھوٹی بچی کو دیکھا جو سال بھر کی عمر کے زمانے میں اپنے ہونٹوں پر اس طرح اُنکلی رکھتی تھی جیسے کہہ رہی ہو ”چپ“۔ اس کے والدین بھی اُس کے اس اشارے سے یہی سمجھتے، اور جب وہ کھیل رہی ہوتی تو وہ اس کے سامنے اسی طرح ہونٹوں پر اُنکلی رکھتے کبھی کبھار وہ بھی اپنے ہونٹوں پر اُنکلی رکھ لیتی اور وہ لوگ بہت خوش ہوتے۔ رفتہ رفتہ وہ دو سال کی عمر تک ہر کس و ناکس کو اسی طرح اشارہ کرتی اور جب کوئی اس کو متوجہ کرتا تو وہ ”چپ“ رہنے کا اشارہ کرتی۔

اسی طرح آپ نے چھوٹے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ جب وہ بولنا شروع کرتے ہیں اور ان کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلنے لگتے ہیں تو اکثر والدین اُن کی تو تلی زبان سے گالیاں سن کر بڑا لطف اُٹھاتے ہیں۔ یہ ناعاقبت اندیش اپنے ہاتھوں ہی اپنے بچوں کو خراب کرتے ہیں۔ اُن کو کون سمجھائے کہ اس زمانے میں تم اُن کو جو کچھ سکھاؤ گے وہی اُن کی عادت بن جائے گی۔

بہر حال آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ گھر ہی وہ جگہ ہے جہاں سے بچہ اپنی زندگی کے لئے پہلی اور روزمرہ کی باتیں سیکھتا ہے، وہیں سے وہ رہن سہن، بات چیت، طور طریقہ وغیرہ سیکھتا ہے۔ آپ کے گھر میں کیا ہوتا ہے؟ آپ کا بچہ اس کو کڑی نگاہ سے جانچتا ہے، اور یہ سمجھ کر جانچتا ہے کہ اُس کے گھر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے صحیح ہو رہا ہے۔ کیوں کہ آپ بھی تو جب کسی غلط بات پر اڑ جاتی ہیں تو یہی سمجھ کر جھمتی ہیں کہ آپ حق پر ہیں۔ تو پھر وہ بے چارہ ننھی سی جان، آپ کی اتنی بڑی بڑی باتوں کو کیسے جانچ سکے گا کہ آپ اتنا تو ٹھیک کر رہی ہیں اور اتنا غلط۔ وہ تو کچھ بھی نہ سمجھے گا، سوائے اس کے کہ اس کے یہاں جو کچھ جس طرح ہو رہا ہے اسے ویسے ہی ہونا چاہیے اور وہ ویسا ہی ہو جائے گا۔

اس لئے آپ سب سے پہلے بچے کے گھر اور گھرانے پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ وہ اس کے لیے کتنا موزوں ہے۔ آپ اچھی طرح پُرکھ کر اور چھان پھٹک کر اُن باتوں کو ہونے سے روکیے جو بچے کے معصوم ذہن پر غلط اثر ڈالیں۔ آپ اُس کو پورا موقع دیں کہ وہ جس جگہ پہلی مرتبہ آنکھ کھول رہا ہے وہاں اُسے اپنی آئندہ زندگی کے لئے اچھائیاں ہی

اچھائیاں دیکھنے کو ملیں۔

## ماں اور بچہ

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو گویا وہ ایک دنیا سے زہت ہو کر دوسری دنیا میں آتا ہے، اُسے وہاں اتنی روشنی میسر نہیں ہوتی، ایسی ہوا کا سامنا کرنا نہیں ہوتا، ایسے سخت سخت ہاتھوں کے چھونے سے دو چار نہیں ہونا پڑتا۔ اس کے لئے یہ بہت ہی بڑی تبدیلی ہوتی ہے جس کا سامنا کرنا بچے کے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے کہ وہ اُس وقت بھی اُس کی مدد کرتا ہے، اُسے اس نئے ماحول میں حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت عطا فرماتا ہے، اور بچہ رفتہ رفتہ اپنے ارد گرد کی چیزوں سے روشنی سے، ہوا سے اور اٹھائے بٹھائے جلنے سے۔۔۔ مانوس ہونے لگتا ہے اور جلد ہی اُسے ایسا لگنے لگتا ہے کہ جیسے وہ اس ماحول میں ہمیشہ ہمیشہ سے رہ رہا ہے۔

ماں ہی وہ ہستی ہے جس سے بچہ ہر وقت قریب رہتا ہے۔ وہ کم از کم ایک سال تک اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ کھا سکتا ہے، نہ پی سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے اور نہ اپنی ضرورت اور تکلیف کے بارے میں خود ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے۔ بلکہ یہ ماں ہی ہے جو اس کی ہر بات کو سمجھتی ہے اور اسے پورا کرتی ہے۔ وہ روتا ہے تو اسے دودھ پلاتی ہے، وہ ہاتھ پیر پھینکتا ہے تو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ اس کے اشاروں میں دل چسپی لیتی ہے اور اس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ اس کے سامنے طرح طرح سے ہر لفظ دہرائی ہے، اور وہ بھی اسی طرح اپنے ہونٹ پلانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہی وہ آغوش ہوتی ہے جس میں وہ سکون پاتا ہے، یہی وہ آرام دہ مقام ہے جس میں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ آپ اپنے بچے کو گود میں لے کر سٹائیے، دیکھیے وہ کتنی جلد سو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ بستر پر سٹلانے کی کوشش کیجیے تو اُسے سونے میں کافی دیر لگ جائے گی، وہ کھسک کھسک کر آپ کے پاس آجائے گا اور آپ سے لپٹ کر سونے کی کوشش کرے گا لیکن جب اسے کامیابی نہ ہوگی تو بڑی الجھن محسوس کرے گا اور اسی الجھن کی وجہ سے کچھ دیر تک جاگتا رہے گا۔

آپ اپنے بچے کے پاس لیٹی رہیے، یا اس کے پالنے کے پاس بیٹھی رہیے۔ وہ خوش رہے گا، لیکن جیسے ہی آپ اٹھنے لگیں گی وہ رونا شروع کر دے گا۔ آپ اس کو کوئی کھلونا دے جائیے، وہ اس سے کھیلتا رہے گا، لیکن جب کھیلتے کھیلتے اس کی طبیعت بھر جائے گی تو وہ پھر آپ کو تلاش کرنے لگے گا اور آپ کو نہ پا کر رونے لگے گا۔

وہ تو آپ ہی کو اپنا محافظ سمجھتا ہے۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی جس چہرے کو ہر وقت اپنی آنکھوں سے قریب پایا ہے وہ آپ ہی کا ہے۔ اب اگر وہی چہرہ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو وہ کیسے اطمینان کر لے کہ وہ محفوظ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے اس پر ننگراں بنایا ہے وہ اپنے قرص کی ادائیگی میں مستعد ہے۔

مگر آپ کو تو اور بھی دوسرے کام لگے رہتے ہیں، اگر آپ انہیں نہ کریں تو آخر یہ گھر کا دھندا کیسے چلے؟ آپ نے سالن کی پتیلی چوٹھے پر چڑھا دی، پیاز، سرخ ہونے لگی اور بچے نے رونا شروع کر دیا۔ اب بتائیے آپ کیا کریں؟ آپ کی جان تو مصیبت میں ہو گئی۔ پتیلی چھوڑیں تو پیاز بھسم ہو جاتی ہے، گھی اکارت ہو جاتا ہے اور اگر بچے کے پاس نہیں جاتی ہیں تو وہ جان ہلکان کئے دیتا ہے۔ لیکن دیکھیے نا، اس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو بے چارہ اکیلا پڑا ہوا ہے، مگر سونا ہے، اس پاس سے کسی کی بول چال کی بھی آواز نہیں آرہی ہے۔ اس کا محافظ کہاں ہے؟ وہ اُسی کو تلاش کر رہا ہے۔

اب یہ اور بات ہے کہ آپ ٹھنڈا ہٹ میں اٹا سیدھا کام کریں اور جا کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھائیں دو ایک چپت رسید کریں اور خوب جی بھر کر بڑبڑائیں۔ وہ آپ سے سہم جائے گا اور کیا کرے گا؟ وہ تو اُمید کر رہا تھا کہ وہی جانے پہچانے چہرے والی ہستی آئے گی، بڑے پیار کے ساتھ اس کو گود میں اٹھائے گی، اس کو تھپکیاں دے گی، لوریاں سنائے گی اور چہرہ سو جائے گا، مگر ایسا نہیں ہے، اب وہ جان گیا کہ رونا جرم ہے۔ اگر وہ پھر رویا تو پھر ایسی ہی سزا پائے گا۔

ایک تو اکیلے پن کی وجہ سے اس کو خوف تھا ہی، آپ نے اس کو یہ بھی جتلا دیا کہ وہ مجرم بھی ہے۔ دیکھیے اس نے آپ سے کس طرح یہ دو باتیں سیکھیں۔

اسی طرح وہ آپ کے ہر عمل فعل سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو میں آپ کو اس کے ثبوت کے لئے آسان طریقہ بتاؤں۔ آپ اپنے کسی عزیز سے — اپنے شوہر سے یا اپنی سہیلی سے — اپنے بچپن کی باتیں کرنا شروع کیجئے بالکل اس زمانے کی جب آپ کی ماں اسی طرح آپ کی پرورش کر رہی تھیں جس طرح آج آپ اپنے بچے کو پال رہی ہیں۔ دیکھیے کسی کسی باتیں آپ کو یاد آتی ہیں۔ آپ کی ماں ایسی تھیں، آپ کی ماں ویسی تھیں۔ آپ کی ماں فلاں کام یوں کرتی تھیں، آپ کو یہ سکھایا وہ سکھایا، غرض بہت کچھ آپ کو یاد آئے گا۔ اب اپنی زندگی پر نظر ڈالئے۔ دیکھیے کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جو آپ بالکل اسی طرح کرتی ہیں جس طرح آپ کی ماں کرتی تھیں، بلکہ اب بھی جب کوئی انوکھی بات سامنے آتی ہے تو آپ یہی کہتی ہیں میرے یہاں تو ایسا کبھی نہ ہوا۔“

میں نے آپ کو ایک کہاوت سنائی تھی کہ ماں کی گود پہلا مدرسہ ہے۔ جی ہاں، تو اس مدرسے میں بچہ کیا سیکھتا ہے؟ وہی جو کچھ آپ اسے سکھاتی ہیں۔ آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ جب آپ نے مدرسے جانا شروع کیا تھا تو آپ کی اُستانی نے آپ کو ریشم کے پھول کاڑھنے سکھائے تھے۔ اس وقت آپ نے کیسے اُلٹے سیدھے، ٹیڑھے میڑھے ڈوب ڈالے تھے، مگر پھر آپ کا ہاتھ صاف ہو گیا اور آپ اچھے اچھے پھول بنانے لگیں، بالکل ان ریشم کے پھولوں کی ہی طرح آپ بچے کے سامنے جانتے بوجھتے یا انجامانے میں ایک کام کرتی ہیں، وہ اسے دیکھتا ہے، وہ بھی پہلے آپ ہی کی طرح اُلٹے سیدھے قدم اٹھاتا ہے، پھر آپ ہی کی طرح عمل کرنے لگتا ہے۔ اگر آپ صاف ستھری رہتی ہیں، تو وہ بھی صاف ستھرا رہے گا، اگر آپ چیزوں کو قرینے سے رکھتی ہیں تو وہ بھی سوچے گا کہ چیزوں کے رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ غرض آپ اپنے رہن سہن میں اس کا خیال رکھیں اور یہ سمجھ کر نہ ٹال دیں کہ یہ تو ابھی بچہ ہے، یہ کیا جانے؟ دراصل وہ تو جاننے کی مشق ہی کر رہا ہے، پھر وہ کیوں نہ جانے گا؟

آپ اس کو اچھی طرح یقین دلا دیں کہ آپ اس کی ماں ہیں، آپ کو اس سے بے انتہا محبت ہے، آپ اس کا ہر وقت خیال رکھتی ہیں اور یہ جو کچھ آپ کر رہی ہیں اسی کے لئے تو کر رہی ہیں، تاکہ اس کو یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے اس کا نگرہا بنا لیا ہے وہ اس



کی طرف سے غافل نہیں ہے۔

آپ کا خیال بھی صحیح ہے کہ بے جالاڈ پیار بچے کو خراب کر دیتا ہے۔ مگر دیکھیے نا! میں نے یہ کب کہا کہ آپ بے جالاڈ پیار کریں؟ میں تو خود ہی کہتا ہوں کہ یہ اس کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے۔ البتہ اتنا اور سمجھتی چلیے کہ جب آپ اپنی اہلی سے ہمیشہ خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتی رہتی ہیں اور اسے نہ بُرا کہتی ہیں اور نہ مارتی ہیں، تو پھر آپ کے اس ننھے دوست نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ آخر اس کی آپ سے کیا دشمنی ہے؟ اس کو تو آپ کی محبت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پھولوں کو سورج کی کرنوں کی۔ نہ کم نہ زیادہ۔ دھوپ تیز ہو گئی تو پھول ٹھلس گئے۔ دھوپ کم ہو گئی تو پھول مہلا گئے۔

میں کہنے کو تو بہت سی باتیں کہہ گیا ہوں! اور مجھے آگے چل کر ان باتوں کا پھر سے تذکرہ کرنا ہے، لیکن یہاں مختصر طور پر نہیں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ماں بچے کے لئے بڑی اہم ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ آپ خود کیجیے۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ وہ آپ کے ہی گوشت پوست کا ٹکڑا ہے۔ آپ جتنی فکر اپنے ہاتھ پیر اور دوسرے جسمانی حصوں کی کریں اتنی ہی اس کی بھی کریں، بلکہ اس سے بھی زیادہ!

## باپ اور بچہ

ماں کو تو خیر بچہ چھو کر اور محسوس کر کے ہی پہچان لیتا ہے لیکن باپ کو وہ اسی وقت پہچانتا ہے، جب اُس کی نگاہ ٹھہرنے لگتی ہے، اور وہ اپنے اُس پاس کی چیزیں گزریں گزریں گزرنے کے فاصلے پر آسانی سے پہچان لیتا ہے۔ اس سے پہلے ماں کے علاوہ وہ کسی کو بھی نہیں جانتا۔ آپ نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ آپ بچے کو کسی اور کے پاس سُلا جائیے۔ ممکن ہے کافی دیر تک وہ اس کے پاس سوتا رہے لیکن بالآخر وہ رونے لگے گا۔ اس کی نگاہیں آپ کو تلاش کرنے لگیں گی۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہ ہوگا جب تک آپ اس کے پاس نہ آجائیں گی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ماں کے علاوہ کسی اور کے پاس سو رہا ہے اور پھر جب وہ اس غیر آغوش میں گھسنا چاہتا ہے تو ایک دم چونک پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے، آخر کیوں؟ وہ

آپ کو تلاش کر رہا ہے، لیکن اکثر باپ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بچے کی زندگی کے اس دور میں بلاوجہ اس سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ وہ اس کے باپ ہیں۔ بھئی اس میں کیا شک ہے، لیکن ابھی وقت تو آنے دیجئے کہ وہ یہ جان جائے کہ باپ ایسا وجود بھی کوئی ہو سکتا ہے، زبردستی ایک چیز کو وقت سے پہلے منوانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بشیر خوار بچے کو باپ محض محبت کی وجہ سے ماں سے اتنی دیر تک الگ رکھتا ہے کہ وہ بے چارہ گھبرا اٹھتا ہے، رونے لگتا ہے اور روتے روتے مایوس ہو جاتا ہے اور چپ ہو جاتا ہے۔ یہ بچتے کے ساتھ ظلم ہے۔

اسی طرح جب بچہ اپنے قریب ماں کے علاوہ روزہا ایک اور چہرہ دیکھتا رہتا ہے تو وہ اس سے مانوس ہو جاتا ہے کبھی وہ اس ہستی کو کھانا کھلا رہی ہوتی ہے۔ کبھی بعض دوسرے کاموں میں اس ہستی کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا تو ہے، لیکن سمجھ نہیں پاتا۔ مثلاً گھر کے تمام ہی کام — تو وہ جان جاتا ہے کہ یہ چہرہ، یہ ہستی بھی اس کی اپنی ہی ہے، اور جب وہ یہ جان جاتا ہے تو باپ کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے وجود سے اچھی طرح مانوس کرادے۔ اکثر باپ تو جیسے اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے بری سمجھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جیسے بچے سے دل چسپی لینا ان کا کام نہیں ہے، وہ کبھی اس کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوتے۔ بس ایسے ہی کبھی کبھار چمکار لیا، گد گدا دیا، یا گود میں اٹھالیا، ورنہ ان سے کوئی واسطہ نہیں، ماں جانے اور اس کا بچہ، ان سے کیا سروکار، حقیقت میں یہ باپ بھی ظلم کرتے ہیں۔

بچہ اپنے وجود کو ہمیشہ اہم سمجھتا ہے، اور بچہ کیا، ہم آپ سب ہی ایسا سمجھتے ہیں۔ ایک ذرا سی میزبانی میں کمی رہ جائے، آپ ناک بھوں پڑھا کر چلی آئیں گی اور محلے والیوں سے خوب خوب شکوہ کریں گی۔ یہی حال مردوں کا ہے۔ پھر آخر وہ بچہ کیوں نہ اپنے وجود کو اہم سمجھے، اسے بھی شکایت کا موقع نہ ملنا چاہیے۔

باپ کی اہمیت بچے کی نظر میں یوں بھی زیادہ ہے کہ جب وہ اپنی عمر کی دو عین مستزلیں گزرا رہتا ہے تو اسے یہی کہہ کر ڈھکایا جاتا ہے۔ "آنے دو، تمہارے ابو سے شکایت کروں گی" اور وہ جاننے لگتا ہے کہ اس کے ابو ہی سب سے زیادہ طاقتور ہیں، انہی کی حکومت ہے، انہی سے

سب ڈرتے ہیں اور اپنی کا کہنا سب کو ماننا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کو بھی اُبُو کا جیسا ہونا چاہیے، تاکہ وہ بھی سب سے زیادہ طاقتور ہو جائے، اس سے بھی سب ڈرنے لگیں، اس کا بھی حکم سب ماننے لگیں۔ اس طرح وہ اپنے باپ میں کافی دل چسپی لینے لگتا ہے اور اپنی کی عادتوں کو اپنانے لگتا ہے، ایسے وقت میں باپ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بچے کے سامنے اپنی صرف اپنی عادتوں کو ظاہر ہونے دے، بن کو وہ پسند کرتا ہے۔ وہ بچے کو یہ بھی یقین دلا دے کہ اس کی ماں کی طرف اس کو بھی اس سے محبت ہے۔ وہ بھی اس کا دوست ہے، اس کو بھی اس سے کافی دل چسپی ہے۔

اس کے علاوہ بچے کے لئے باپ وہ آخری فرد ہوتا ہے جو اس کی بات کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔ وہ بائیں جن کا حل ماں کے پاس بھی نہیں ہوتا تو وہ سمجھتا ہے کہ باپ انہیں خوشی بجلاتے ہی سمجھا دے گا۔ اسی لئے وہ جب پوچھنا چاہتا ہے تو پہلے ماں سے پوچھتا ہے اور جب اس کو ماں کے جواب سے اطمینان نہیں ہوتا تو وہ باپ کے پاس آتا ہے اور باپ اپنے کاروبار میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ اس کو بچے کی یہ شوخی ذرا بھی پسند نہیں آتی اور وہ اسے جھڑک دیتا ہے۔ بچے بے چارہ خاموش ہو جاتا ہے۔ وہ یقین کر بیٹھتا ہے کہ اس سوال کا جواب ہے ہی نہیں۔ اب وہ اپنے ذہن میں بڑی الجھن محسوس کرتا ہے، اس کو ایک جواب چاہیے تھا اور وہ بھی نہیں ملتا۔ حالاں کہ اس بے چارے نے کوئی بڑی بات نہیں پوچھی۔ یہی تو پوچھا کہ اللہ میاں کہاں رہتے ہیں؟ وہ بردت سنتا ہے کہ اللہ میاں کرتے ہیں، کھانا دیتے ہیں، پانی برساتے ہیں، یہ کرتے ہیں، وہ کرتے ہیں بچہ آخر اس نے اگر یہ پوچھ لیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔؟

آپ ذرا اس کے سوالات کو سنیں، ان کے جواب دینے کی کوشش کریں۔ ایسے معقول جواب جو اس کی سمجھ کے مطابق ہوں۔ یہ موقع آپ کے لئے بہت نازک ہے۔ اگر آپ نے اسے ڈانٹ دیا تو یوں سمجھیے کہ آپ نے اس کے سوچنے اور سمجھنے کی قوت کو سخت نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اس طرح آپ اسے گند ذہن کر دیں گے اور اتنا ہی اسے چڑھاؤ اور بد مزاج بھی بنا دیں گے۔

ایسی ہی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کے جواب بچہ چاہتا ہے اور ماں کے علاوہ باپ ہی اس کی تسلی کر سکتا ہے۔ جہاں بچہ اس کے عادات و اطوار دیکھنے کا وہیں اسے اپنی دماغی صلاحیتوں کو بڑھانے میں مددگار بھی پائے گا۔ اس لئے باپ کو بھی بہت محتاط رہنا چاہیے اور بچے کے لئے ایک اچھی مثال بن کر رہنا چاہیے۔

## دوسرے گھروالے

بعض گھرانوں میں تو بچے کے لیے اس کی ماں اور اس کا باپ ہی اس کی پوری دنیا ہوتے ہیں، وہ گھر میں کبھی کبھار تو ضرور کسی غیر چہرے کو دیکھ لیتا ہے لیکن مستقل طور پر وہ اپنی دوسری واقف ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اکثریت تو ان گھرانوں کی ہے جن میں اور دوسرے عزیز نہ بھی ہوتے ہیں۔ کوئی اس کی دادی ہے، کوئی چچی، کوئی بھائی ہے، کوئی بہن، کوئی آیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام لوگ وہ ہوتے ہیں جنہیں وہ ماں اور باپ کے علاوہ ہر وقت دیکھتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے کام کاج دیکھتا ہے، ان کے بھگڑے فساد دیکھتا ہے، اور یہ سب سمجھتے ہیں کہ وہ چاہے جو کچھ کریں، ان کا اثر بچے پر کیوں پڑنے لگا؟

دیکھیے، آپ دونوں کے محتاط رہنے کے باوجود وہ یہ چور دروازہ تلاش کر سکتا ہے اور آپ یہ جانتی ہیں کہ بُرائی کو پروان چڑھنے کے لئے معمولی سا سہارا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ تو بھلائی ہوتی ہے جو محنت چاہتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے پودینہ آپ کی کیا ریوں میں بڑی دیکھ بھال کے بعد اگتا ہے اور گھاس آپ ہی آپ اُگ آتی ہے۔ ایسے ہی بچے میں بھلی عادتوں کے بیج بونے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور بُرائی کے لئے تو بس ایک ذرا ہی بے پروائی کافی ہے۔

خاص طور سے اگر آپ نے اس کے لئے کوئی آیا، یا بھلائی نوکر رکھ لی ہے تو اس کے اخلاق پر کڑی نظر رکھیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا، فاحشہ عورت کا دودھ بچے کو پلانے سے منع کیا گیا ہے۔ کیوں؟ — یہی وجہ ہے۔

اگر ان دوسرے گھروالوں میں سے کوئی شخص اس کے سامنے جھوٹ بولتا ہے اور بچہ یہ جانتا ہے کہ بات اصل میں یوں نہ تھی، پھر وہ شخص جھوٹ بول کر بچہ جاتا ہے تو بچہ بھی اس خرابے کو آزمائے گا۔

ان دوسرے گھروالوں کی ایک خاص عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ کبھی تو وہ بچے میں بے انتہا دل چسپی لینے لگتے ہیں اور پھر ایک دم اس کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ جب یہ لوگ اس سے دل چسپی لینا کم کر دیتے ہیں تو وہ عجیب اُلجھن میں پھنس جاتا ہے۔ اپنی اہمیت کو جتانے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر ناکام ہو کر مایوس ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کی یہ بے پروائی اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ گھروالے اکثر ایک کہرام سا بھی مچائے رکھتے ہیں۔ کبھی کسی سے جھگڑا گئے، کبھی کسی میں کڑے نکالنے لگے، یا کبھی بے بات کی بات لے بیٹھے۔ آخر بچہ ان سب باتوں سے کیوں نہ اثر لے؟ وہ اثر لیتا ہے اور آپ کی احتیاط کے باوجود اس میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

معلوم نہیں کیوں ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کی بھی اُن سے اُن بن رامتی ہے؟ ساری خرابی آپ میں ہی تو نہیں ہے؟ تو پھر کیا ساری خرابی اُن میں ہے؟ — آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجیے، خرابی کس میں کتنی ہے اور اس کے جانچنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ آپ وہ بن جائیں اور اُن کو اپنی جگہ پر رکھیں، اور اب دیکھیں کہ اگر یہ بات اسی طرح ہوتی تو ان کی جگہ ہونے پر آپ کیا کر میں؟

قینچی کی نوک ٹوٹ جانا ایسی کوئی بڑی بات تو نہ تھی۔ کبھی نہ کبھی تو وہ ٹوٹی ہی، پھر اس ہونے والی بات کا کیا غم؟ مانا کہ گرانی ہے۔ آپ دوسری قینچی نہیں خرید سکتیں، لیکن دیکھیے نا، بچے کی زندگی تو اس سے بھی زیادہ گراں ہے، آپ اسے تو کبھی بھی نہ خرید سکیں گی۔ پھر آپ جھگڑا کر اُسے کیوں یہ سکھاتی ہیں کہ دیکھ تو بھی یوں جھگڑنا!

جی ہاں، مجھے یاد ہے، میں بات دوسرے گھروالوں کی کر رہا تھا، آپ کا تذکرہ میں کیوں لے بیٹھا؟ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ دوسرے گھروالوں کو کبھی یہ کہہ کر خاموش نہیں کر سکتی ہیں کہ دیکھو میرا بچہ خراب ہو جائے گا۔ ہاں بس یہی ایک ترکیب ہے کہ آپ اپنی طرف

سے دوسرے لوگوں کو اس کا موقع نہ دیں، نوکروں میں جن کو سدھار سکتی ہیں سدھاریں، ورنہ ان کی جگہ دوسرے رکھیں۔ گھر والوں کو آپ تکال تو نہیں سکتیں، البتہ اپنے عمل سے ان کے رُفیتے کو بدل سکتی ہیں، پھر بچہ آپ ہی آپ سیکھ جائے گا کہ دوسرے گھر والوں سے کیوں کر پیش آنا چاہیے۔

اس طرح بچہ آنکھ کھولتے ہی یہ سیکھ جاتا ہے کہ وہ کون ہے، اس کے عزیز کون کون ہیں، وہ کیا کیسے کرتے ہیں، اور اُسے بھی کیا، کیسے، کرنا ہے۔ اس کا مزاج دو سال کی عمر سے بدلنا شروع ہو جاتا ہے، اور آئندہ چار سال تک وہ آپ سے بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کے قیمتی سال ہوتے ہیں، پچھ سال کی عمر تک آپ اسے معصوم سمجھتی ہیں، حالانکہ وہ اتنا کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے کہ اگر پندرہ سال کی عمر تک وہ اور کچھ نہ سیکھے، تو یہ معلومات اس کے لئے کافی ہوں گی۔ پھر ہی سب عمل اور فعل اس کی عادتیں بن جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ، چوری یا تحمل، نیک مزاجی اور عالی بہتھی وغیرہ۔

اس لئے اپنے بچے کو ایک اچھا گھر اور اچھا گھرانہ دیجیے، اور پھر یہ اُمید لگائیے کہ وہ صالح طبیعت کا مالک بن جائے گا۔

## چند لفظوں میں

- گھر میں جو کچھ ہوتا ہے، بچہ اُسے کڑی نگاہ سے جانچتا ہے، اور اُسے صحیح سمجھتا ہے۔
- بچے کو آنکھ کھولتے ہی زندگی کے لئے اچھے اوصاف کے انتخاب کا موقع فراہم کریں۔

## ماں اور بچہ

- بچہ ماں کے ہر عمل و فعل سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ اس لئے آپ اپنے رہن سہن میں اس کے لئے اچھا سبق فراہم کریں۔
- بے بالا ڈ پیار سے بچے کو خراب نہ کریں۔

## باپ اور بچے

- بچے کو قبل از وقت باپ کے رشتے کی اہمیت کا احساس نہ دلائیے۔
- بچے کی ذات میں دل چسپی لینا نہ بھولیے، ورنہ اُس کی اہمیت مجروح ہوگی۔
- بچے باپ کو سب سے زیادہ با اختیار سمجھتا ہے، اس لئے آپ اُسے ہمیشہ صحیح اور صالح ہدایت دیں۔

- بچے کے ذہنی اور اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لئے اپنے ذہنی اور اخلاقی معیار کو بہتر بنائیے۔

## دوسرے گھروالے

- دوسرے گھروالوں کو بھی اپنی کمزوریوں سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ بچے ان پر بھی نظر رکھتا ہے۔

- بچے میں دل چسپی لیتے ہوئے اس کا خیال رکھیے کہ یہ نہ کبھی حد سے زیادہ ہو اور نہ بے حد کم!

- دوسرے گھروالوں کے رویے کو اپنے عمل سے بدلنے کی کوشش کیجیے۔

- جن نوکروں کو سدھار سکتی ہوں، سدھاریں، ورنہ ان کی جگہ دوسرے رکھیں۔

## بچے کے ابتدائی سال

جب آپ بچے کے لئے گھر اور گھرانے کو سنوارنا شروع کر دیں تو ساتھ ہی ساتھ اس کی طرف بھی توجہ دیتی رہیں۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ بچے کم از کم ایک سال کی عمر تک اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ ہی اس کے لئے سب کچھ کرتی ہیں لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ بہت کچھ اپنے آپ ہی کرنے لگتا ہے۔

میرے چھوٹے بھائی نے دو سال کی کم عمر سے اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں اگر کوئی اسے بھلانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ بھل جاتا تھا۔ ایسے ہی تمام بچے ایک عمر تک آپ کی مدد چاہتے ہیں، کبھی کھانے میں کبھی کوئی بات سمجھنے میں، کبھی کوئی کام کرنے میں۔ لیکن جب یہ زمانہ گزر جاتا ہے تو پھر ان کو آپ کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ خود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس لئے یہ آپ کا فرض ہو جاتا ہے کہ جس زمانے میں اس کو آپ کی مدد کی، آپ کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے، آپ اس کی طرف پوری توجہ دیں۔ آپ کی یہ توجہ اس کی ان دو چیزوں کی طرف خاص طور سے ہونی چاہیے۔

○ — جسمانی صحت

○ — ذہنی صحت

جی ہاں، سب سے پہلی اور ضروری چیزیں یہی ہیں۔ ان میں اگر ایک کی بھی دیکھ بھال میں کمی رہ گئی تو آپ لاکھ ختن کر ڈالیے بچہ اپنی آئندہ زندگی میں دوسروں کا محتاج بن کر ہی زندہ



رہے گا۔ اس کو بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتی ہیں۔

## جسمانی صحت

مگر بچے کی جسمانی صحت کے لئے تو آپ کو اس وقت سے خیال رکھنا چاہیے جب کہ وہ ابھی پیدا نہ ہوا ہو۔ اس زمانے میں عام طور سے ماؤں کو ایسی غذاؤں سے منع کیا جاتا ہے جو جلد ہضم نہیں ہوتیں۔ ایسی چیزیں بھی کھانے سے روکا جاتا ہے جو بہت تیز ہوتی ہیں۔ بہت گرم پیزیا نقصان دہ ہوتی ہیں۔ زیادہ تر تازہ پھل اور ترکاری استعمال کی جاتی ہے۔ مجھے یہاں یہ نہیں بتلانا ہے کہ ایسے زمانے میں کیا کھایا جائے یا کیا نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ بچے جس وقت ماں کے خون سے پرورش پا رہا ہوتا ہے اس کو تمام مُضر چیزوں سے بچانا ماں کا فرض ہوتا ہے۔ اگر اس زمانے میں اس کی پر و ا نہ کی گئی تو سمجھ لیجیے کہ پھر آئندہ اس کا سنبھلنا محال ہی ہوگا۔ آپ جب روٹیوں کے لئے آٹا گوندھتی ہیں تو اس کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ وہ نہ تو سخت ہو جائے اور نہ بالکل پتلا ہو جائے، لیکن جب آپ کی مرضی کے خلاف آٹا پتلا ہو جاتا ہے تو پھر اچھی روٹیاں تیار نہیں ہو پاتی ہیں۔ بالکل یہی حال اس زمانے میں بچے کی خوراک کا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں آپ کو اپنی صحت کا بھی خاص خیال رکھنا ہوتا ہے، ورنہ یہ بڑا آسان ہے کہ جو بیماری آپ کو ہے وہی بچے کو بھی ہو جائے۔ مثال کے طور پر کچھ بھائی بہنوں کو پیدائشی نزلہ ہوتا ہے اور انہیں اس سے کبھی بھی چھٹکارا نہیں ملتا۔ ایسے ہی بہت سے ایسے مرض ہوتے ہیں جو والدین کی وجہ سے بچوں کو ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ذمہ، ذیابیطس، فشارِ دم (بلڈ پریشر)، جنسی امراض وغیرہ۔

پیدائش کے بعد بھی ماں کے اپنے مرض بچوں کو منتقل ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کا سبب ماں کا دودھ ہے۔ بچے کو صحت مند ماں کے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس کو ایسا دودھ نہیں ملتا تو وہ بھی اسی مرض کا شکار ہو جاتا ہے جو ماں کو لاحق ہے۔

دودھ کے سلسلے میں ایک بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے؛ اور یہ بات اُن ماؤں سے متعلق ہے جن کے بچے دودھ پلائوں کے سہارے پرورش پاتے ہیں۔ دودھ پلائی

کے بچے کی عمر وہی ہونی چاہیے جو آپ کے بچے کی ہو، ورنہ دوسری صورت میں بچے کے معدے کے خراب ہو جانے کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔ خاص طور سے یہ تو ہمیشہ خیال رکھیے کہ ان دو رضاعی بچوں میں آپ کے بچے کی عمر کم نہ ہو، ورنہ ایسے دودھ کو مضم کرنا اس کے لئے مشکل ہوگا۔ بچوں کو دودھ اور غذا بھی وقت ہی سے دینی چاہیے۔ اکثر مائیں تو یہ سمجھتی ہیں کہ بچہ رونا محض اس لئے ہے کہ اس کو بھوک لگی ہے اور وہ جلدی سے اپنا فرض اتار ڈالتی ہیں۔ بھئی! ذرا یہ تو معلوم کرنے کی کوشش کیجیے کہ کیا اس کے علاوہ اس کو کوئی ضرورت تو نہیں اور اس کو کوئی تکلیف تو نہیں، وہ کہیں ڈر تو نہیں گیا؟ — اگر ان میں سے کوئی بات ہے تو پہلے اس طرف توجہ دیجیے، ورنہ آپ جانتی ہیں کہ ہر وقت معدے کو لبالب بھلا رکھنا اچھا نہیں۔

اور ہاں، اکثر مائیں یہ بھی کرتی ہیں کہ وہ بچے کو محض اس وجہ سے جلد جلد دودھ پلاتی رہتی ہیں کہ وہ رونے نہ پائے۔ ابھی دو گھڑی گزرنے نہیں پائیں کہ انھوں نے اس کو دودھ پلا دیا، یا کچھ اور کھلا پلا دیا — آپ یہ کرتی تو اپنی آسانی کے لئے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتیں کہ بچے کو اس سے کتنا نقصان پہنچتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں بچے کا معدہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ غذا کو مضم کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔ دودھ ڈالنا، دست آنا وغیرہ اسی بنا پر ہوتا ہے۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ بچے کو غذا دینے کے لئے وقت مقرر کر لیں اور وقت پر ہی اس کو غذا دیں۔

غذا کے سلسلے میں ایک بات اور جان لیجیے :

بچے کو ہمیشہ اس کی غذا دیجیے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کو کریلے بہت پسند ہیں اس لئے آپ اس کو کریلے ہی کھلائیں، چاہے وہ کتنا ہی مٹھ بنائے۔ آپ کا کہنا درست ہے کہ انسان کو ہر غذا کی عادت ہونی چاہیے۔ کیا معلوم کب کیسا موقع پڑے۔ مگر اس طرح اگر آپ اس کو زبردستی کھلائیں گی تو وہ ذوا کی طرح رو رو کر کھا تو لے گا۔ لیکن آئندہ وہ اسے ذوا ہی سمجھ کر کھائے گا۔

دیکھیے میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں — ایک بچے کو نازنگیاں بہت پسند تھیں، وہ بہت شوق سے نازنگیاں کھایا کرتا تھا۔ ایک بار وہ بیمار پڑا۔ ڈاکٹر نے اس کو نازنگیاں کھانے کے لئے بتایا اور جو دوا تجویز کی وہ بہت ہی کڑوی کسلی تھی۔ بچہ دوا کے ساتھ نازنگیاں کھانا پسند نہ کرتا تھا، لیکن اس کے ماں باپ نے اس کی صحت کے خیال سے اسے زبردستی نازنگیاں کھلائیں۔ جب وہ اچھا ہو گیا تو اس نے پھر کبھی نازنگیوں کو منہ نہ لگایا۔

مجھے خود اپنے بارے میں اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں مجھے ترکاریاں، دودھ اور بالائی وغیرہ محض اس خیال سے زبردستی کھلائی جاتی تھیں کہ کیا معلوم کب کیسا موقع پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکاریوں سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مینا بائیس سال کی عمر تک میں نے کوئی ترکاری نہ کھائی۔ بالائی کے نام سے مجھے ابکائی آتی تھی کچے گھی کی بُو مجھے اب تک پسند نہیں ہے۔ ہاں اس زبردستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکاری سے مجھ کو جو فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، وہ میں نہ اٹھا سکا۔

اس لئے بچوں کو جب آپ غذاؤں تو رغبت دلا کر دیں، زبردستی نہ کریں۔

بچے کی تکلیفوں اور اس کی بیماریوں کا بھی آپ خاص خیال رکھیں۔

شروع شروع میں بچہ اپنی تکلیف آپ نہیں ظاہر کر سکتا۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کچھ کچھ بولنے لگتا ہے تب بھی اپنی تکلیف نہیں بیان کر پاتا، بس وہ جہاں کچھ تکلیف محسوس کرتا ہے رونے لگتا ہے۔

میں نے ایک بچے کو دیکھا تھا جو بڑی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا لیکن جب اس کو کچھ تکلیف ہوئی تو رونے لگا۔ اس کے والدین اس پر بگڑ پڑتے کہ ابھی تو ایسی ایسی باتیں بنا رہا تھا، اور اب بالکل ہی ننھا بن گیا ہے۔ حالاں کہ اس میں اس بے چارے کا کیا قصور تھا؟ اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا، اس لئے وہ رونے لگا تھا، اگر وہ جان ہی سکتا کہ اسے اس درد کو کس طرح ظاہر کرنا ہے تو پھر وہ روتا کیوں؟

بچے کی بیماری بھی بڑی توجہ کی طالب ہوتی ہے۔ میری نظر سے کچھ ایسی باتیں بھی گزری

ہیں جن کا بچہ بیمار ہوا اور انہوں نے شروع میں کوئی پروا نہ کی۔ وہ یہی سمجھتی رہیں کہ معمولی سی بیماری ہے آپ ہی اچھی ہو جائے گی، لیکن بیماری جڑ پکڑ گئی اور لینے کے دینے پڑ گئے۔

جی ہاں! یہ اکثر ہوتا ہے کہ بچہ آپ ہی آپ اچھا بھی ہو جاتا ہے، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کو دوا کا عادی بنا دیا جائے۔ لیکن جس بے پروائی کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہ مناسب نہیں۔ بچے کا جسم جب طرح طرح کی بیماریوں کا سامنا کرتا رہتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے اندر پھر اور بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی اور وہ بستر پر پڑ جاتا ہے۔ وہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ عمر بھر موٹا تازہ نہیں ہو پاتا۔

بیماریوں سے بچائے رکھنے کی بہترین ترکیب احتیاط ہے۔ لو، دھوپ، ٹھنڈک وغیرہ سے اگر بچایا جائے اور غذا میں احتیاط کی جائے تو بیماری کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو صاف ستھرا رکھنا بھی بہت بڑی احتیاط ہے۔ یہ کہاوت تو آپ کو یاد ہی ہو گی کہ احتیاط یا پرہیز علاج سے بہتر ہے۔

بہت لاڈ پیار بھی بچے کی صحت خراب کر دیتا ہے۔

وہ کیسے؟

ایک واقعہ سنئے:

ایک بچہ چار سال کی عمر تک نہ چل سکتا تھا اور نہ بات کر سکتا تھا۔ ڈھائی تین سال کی عمر تک وہ کھڑا بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے تمام خاندان والوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کے پیر بیکار ہیں، اور وہ گونگا ہے۔ بچے کے باپ حکیم تھے، شاید انہوں نے کچھ دوائیاں بھی استعمال کرائیں لیکن وہ نہ چل ہی سکا اور نہ بات کر سکا۔ اس بچے کو کھلانے کے لئے ایک گونگی رکھی گئی تھی۔ اس کے لئے اور کوئی کام تو تھا نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اس کو ہر وقت گود چڑھائے رکھتی تھی، اور جب وہ اس کو زمین پر اتارتی تھی تو سزا پاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچہ جتنی دیر جاگتا رہتا تھا، گود ہی چڑھا رہتا تھا۔ چار سال کے بعد ایک دن وہ گونگی غائب ہو گئی اور بہت تلاش کے بعد بھی نہ ملی۔ آخر کار بچے کے لاڈ پیار میں کمی کرنی پڑی اور وہ ادھر ادھر زمین پر ریٹکنے لگا۔ پھر جلد ہی چلنے لگا، اور پانچ سال کی عمر میں چھوٹے چھوٹے جھلمے

بولنے لگا۔

ایسے ہی اور بھی بہت سے غلط لاڈ پیار ہوتے ہیں جو بچے کو جسمانی طور پر کمزور کر دیتے ہیں۔ متمول گھرانوں کی عورتیں اپنے بچوں کو موٹے چھوٹے کام نہیں کرنے دیتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر میں کلرک یا بابو تو بن جاتے ہیں لیکن تجارت اور محنت مزدوری کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔

آپ اپنے بچے کے لئے اگر یہ پسند کرتی ہیں کہ وہ نواب بن کر جیے تو پسند کیجیے آپ کو کون روک سکتا ہے۔ البتہ میں آپ کو اتنا بتا دوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بکریاں چرائی ہیں۔ انھوں نے خود کھائیاں کھودی ہیں؛ انھوں نے خود پتھر ڈھوئے ہیں اور آپ کی تعلیم بھی یہی رہی ہے کہ کوئی کام ذلیل نہیں ہے۔ آپ نے انہی کاموں کو عزت والا بتایا ہے جن کو آج ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

آپ بچے کو ہاتھ پیروں کے استعمال کرنے کا موقع دیں۔ وہ اگر ہاتھ پیر پھینکتا ہے تو آپ اس سے نہ اُلجھیے۔ اس طرح وہ انھیں استعمال کرنا سیکھتا ہے۔ وہ جیسے جیسے بڑھتا جائے اس کو اسی مناسبت سے اپنی قوت کو استعمال کرنے کا موقع دیں۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ آپ تین چار سال کے بچے سے من دُمن کا بوجھ اٹھوائیں اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ اس کو گلاس اٹھا کر خود پانی نہ پینے دیں۔

آپ بچے کو جس قدر موقع اپنی قوت کے صحیح استعمال کا فراہم کریں گی اس کی جسمانی صحت اتنی ہی اچھی رہے گی۔

## ذہنی صحت

یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ اگر بچے کے دماغ نہ ہوتا تو وہ بالکل بے کار ہوتا۔ نہ وہ کچھ سوچ سکتا، نہ سمجھ سکتا، نہ کوئی اشارہ کر سکتا اور نہ آپ کے اشارے سمجھ سکتا۔ بس ایک گوشت کا لوتھڑا ہوتا جس کے ہاتھ پیر، آنکھ، ناک، کان ہوتے۔ وہ بلی کتے اور مرغی جیسا بھی جانور نہ ہوتا۔ کیوں کہ ان کے بھی کسی حد تک دماغ ہوتا ہے۔ یہ جانور بھی اپنی ضرورت کے

لائق چیزوں کو پہچانتے اور ان سے کام لیتے ہیں۔

اس طرح یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو تمام مخلوقات سے بہتر ذہن دیا ہے اور سب سے زیادہ عمدگی کے ساتھ اسے استعمال کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تمام انسانوں کے ذہن ایک سے نہیں ہوتے، لیکن عام طور سے انہی ذہنی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو دی ہے کہ وہ اپنا کام آسانی سے چلا سکے۔

ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو ذہنی طور پر ناقص ہوتے ہیں یعنی جن کے لئے آپ کہتی ہیں کہ ان میں عقل کی کمی ہے اور ہاں ایسے لوگ بھی زیادہ نہیں ہوتے جن کے لئے آپ کہتی ہیں کہ وہ بے حد عقلمند ہے۔ البتہ انسانی ضرورت بھر عقل عام انسانوں کے پاس ہوتی ہی ہے، لیکن پھر بھی یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عام طور سے ماؤں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے بچے میں سب کچھ ہے مگر عقل نہیں ہے۔

میں پوچھتا ہوں: آپ نے اس کو اپنی عقل استعمال کرنے کا کتنا موقع دیا؟ یہ تعجب کرنے کی بات نہیں! — اگر آپ نے اس کو اپنی عقل استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا ہے تو یہ اس کی اپنی خامی نہیں ہے، بلکہ آپ کی ہے۔ دیکھیے، آپ ناراض نہ ہوں۔ میں نے اپنے ذمے اس وقت کچھ خدمت ہی ایسی لے رکھی ہے کہ ایسی ویسی بات مجھے کہہ دینی ہی پڑتی ہے۔

آپ کی خامی سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ نے خود اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔ آپ نے اُسے بہت سے ایسے کام کرنے سے روکا ہے جنہیں وہ اپنی معلومات بڑھانے کے لیے کرنا چاہتا تھا۔

دیکھیے، ابھی آپ کو نکل سے پہر ہی کی بات بتاؤں، آپ دو پیٹہ رنگ کر الگنی پر پھیلانے چلی گئی تھیں کہ آپ کے ننھے ساتھی نے اُدے رنگ کی ساری کی ساری پٹریا یا نارنجی رنگ میں انڈیل دی، پھر خوب اپنے ہاتھوں سے اُسے گھولا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے گالوں پر رگڑا اور تسلیے میں جھانک کر اپنا منہ دیکھا اور کھلکھلا کر ہنسا۔ اتنے میں آپ آگئیں! — یہ ڈرگت! — تمام رنگ غارت ہو گیا۔ منہ اور کپڑے الگ خراب ہوئے، شیطان کہیں کا۔

آپ کو بڑی طرح غصہ آگیا، اور آپ نے زور زور سے دو تین تھپڑ رسید کر دیئے۔ نقصان تو جو کچھ ہونا تھا ہو ہی گیا۔ افسوس ہونا بھی لازمی تھا۔ لیکن اس بے چارے کا بھی تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ تو یہ جانتا نہ تھا کہ یہ سب پٹریوں میں کیا کیا بندھا رکھا ہے، ان کا مصرت کیا ہے، اور آپ نے یہ جو ایک پٹریا میں سے کچھ تھوڑا سا نکال کر پانی میں ڈالا اور پھر سفید روپٹہ نارنجی کر لیا، یہ آخر کیسے ہو گیا؟ ذرا وہ بھی تو کر کے دیکھے۔ اس سے بھی ایسا ہی ہو سکے گا یا نہیں؟

اسی طرح وہ واقعہ بھی یاد کر لیجیے۔ جب آپ نے اس کو بڑا خوب صورت سامٹی کا کھلونا دیا تھا اور اس نے فوراً ہی زمین پر سرخ کر توڑ ڈالا تھا، اور پھر آپ نے عہد کر لیا تھا کہ آپ اس کو ٹوٹ جانے والے کھلونے بھی نہ دیں گی، مگر محترمہ! اس نے وہ کھلونا توڑا کب تھا؟ وہ تو معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا یہ کھلونا بھی گیند کی طرح اُچھلے گا؟

غرض ایسے واقعات روزانہ پیش آتے رہتے ہیں اور جب آپ کو اس کی کوئی حرکت پسند نہیں آتی تو آپ اس کو سزا دے ڈالتی ہیں۔ آپ کو نہ معلوم کیوں اس کی طرف سے یقین ہو گیا ہے کہ وہ بس نقصان کرنے ہی پر تیار ہوا ہے۔ ذرا بھی کوئی چیز اس کی پہنچ میں ہوتی اور اس نے توڑ ڈالی۔ وہ بے چارا خود پریشان ہے کہ آخر وہ کیا کرے؟ کیسے آپ کو یقین دلانے کہ وہ آپ کا دشمن نہیں ہے۔ وہ اگر آپ کو خوش کرنے کے واسطے چادر بھی تہہ کرنے لگتا ہے تو آپ بگڑ جاتی ہیں۔ ”دیکھ میلی کر ڈالے گا“ اور وہ بے چارہ سہم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آپ اُسے کچھ بھی تو کرنے نہیں دیتیں۔ اس لئے اب اُس کو یقین ہو گیا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔

حالاں کہ آپ اپنے معاملات پر غور کیجیے۔

کروسٹیا یا اُون کی بنائی کے نمونے جب آپ کی نظر سے گزرتے ہیں تو آپ بڑے اشتیاق سے ان کو دیکھتی ہیں، کبھی ادھر لٹتی ہیں کبھی ادھر پلپتی ہیں، اور کبھی تو نمونے کو تھوڑا بہت ادھیڑ بھی ڈالتی ہیں، تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس طرح بنا گیا ہے۔ لیکن آپ اس ننھے معصوم کو اس کا موقع نہیں دیتی ہیں۔ آخر کیوں؟

کیا آپ نے بُنائی کا یہ نمونہ دیکھتے ہی بس یہ جان لیا تھا کہ یہ اس طرح بُنا جاتا ہے؟ اور کیا آپ کو سلائیاں لے کر نہیں بیٹھنا پڑا تھا؟ اور گھنٹوں مغز ماری نہیں کرنی پڑی تھی؟

”کرنی تو پڑی تھی!“

تو پھر آپ اس سے یہ توقع کیسے کر سکتی ہیں کہ وہ ایک چیز کو بغیر آزمائے بغیر جانچے جان جائے؟ اس کو بھی تو جاننے اور سیکھنے کا موقع دیجیے۔

اور جن بچوں کو اس آزمائش کا موقع نہیں ملتا۔ اُن کا ذہن غیر تربیت یافتہ رہ جاتا ہے۔ وہ نہیں جان پاتے کہ جو چیز اُن کے ہاتھ میں ہے وہ کیسے بنی ہے، اس کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ ہر چیز کو چھوتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، ان کو ڈر لگتا رہتا ہے کہ کہیں وہ چیز ان سے خراب نہ ہو جائے۔ وہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی آئے اور اُن کو بتلے کہ وہ اُسے یوں استعمال کریں، اور جب اُن کو ایسا بتانے والا نہیں ملتا تو وہ اگر ڈرتے ڈرتے اس چیز کو استعمال کرتے ہیں تو وہ یقیناً خراب ہو جاتی ہے۔

بچے کے لئے ہونا تو یہ چاہیے کہ جس چیز کو وہ استعمال کر کے جاننا چاہتا ہو اُس میں آپ اُس کی مدد کریں، بیشتر کام اسی کو کرنے دیں۔ جب آپ محسوس کریں کہ اب کام کا اگلا مرحلہ اُس کے بس کا نہیں ہے تو اُس کی مدد کرتے ہوئے کام اپنے ذمے لے لیں، اور اس کو اس طرح سمجھا دیں کہ اس کو محسوس بھی نہ ہو کہ آپ اس کے کام میں دخل در بقولات کر رہی ہیں، ورنہ وہ اپنے ذہن کو استعمال نہ کر پائے گا۔

بچے کو اپنے ذہن کو کام میں لانے کے لئے مختلف قسم کے ذہنی کھیل یا پہیلیاں وغیرہ حل کرنے کے لیے دیجیے۔ مثلاً آپ اس سے پوچھیے: ایک آدمی ایک آنکھ سے ایک میل دیکھتا ہے تو دو آنکھوں سے کتنے میل دیکھے گا؟ وہ فوراً کہہ دے گا کہ ”دو میل!“ آپ اس سے کہیے: ایک آنکھ بند کرو اور دیکھو۔ پھر اس سے کہیے کہ اب دوسری آنکھ بھی کھول دو، اور دیکھو۔ پھر اس سے پوچھیے کہ اب تم کو فرق معلوم ہوا؟ وہ کہے گا۔ ”نہیں!“ اور سوال اس نے خود حل کر لیا۔



تین چار سال کے بچے کے لیے یہ سوال زیادہ مشکل نہیں ہے، لیکن اس سے کم عمر کے بچوں سے چیزوں کے نام، رشتے داروں کے رشتے وغیرہ پوچھ کر اس کے دماغ کو کام کرنے کا موقع دیا جاسکتا ہے۔ وہ جس قدر اپنے ذہن پر زور دے گا اتنی ہی اس کی استعداد بڑھتی جائے گی۔

بچے کہانیاں بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کو کہانیاں سنائیے اور سوچنے کا موقع دیجیے، پہیلیاں سنائیے اور حل کرنے کا موقع دیجیے، لیکن اس کا بھی خیال رکھیے کہ اگر وہ پہیلی بوجھ نہیں پاتا ہے تو آپ ہی اس کی مدد کیجیے۔ مختلف طریقوں سے اشاروں سے آپ اس کو بتائیے کہ اس پہیلی میں یہ ہے، اور پھر وہ آئندہ یاد رکھے گا۔ کبھی ایسا نہ کیجیے کہ ایک پہیلی سنائیے، اگر وہ بوجھ نہ پائے تو اس کا جواب ہی نہ بتائیے۔ اس طرح اس کو اپنی ناکامی کا اتنا احساس ہو جائے گا کہ وہ پھر کبھی بھی آسانی سے اپنے ذہن کو کام میں نہ لائے گا، اور ایسا بھی نہ کیجیے کہ پہیلی سنلتے ہی جواب بھی بتا دیجیے۔ اس طرح تو اور بھی وہ اپنے ذہن پر زور نہ ڈالے گا۔

اگر آپ کی اتنی استطاعت ہے کہ اپنے بچے کے لئے قیمتی کھلونے خرید سکیں تو میکینو، بلاک، تیراتی سیٹ، ڈاکٹروں کا سیٹ وغیرہ خرید کر بچے کو یہ موقع فراہم کر سکتی ہیں کہ وہ اپنے ذہن کو خود ہی بہتر طور پر استعمال کر سکے۔

آپ کبھی بچے کے سامنے یہ نہ کہیے کہ اس کے عقل نہیں ہے۔ وہ فوراً آپ کی بات کا یقین کر لے گا اور اپنی عقل کی محرومی سے مایوس ہو جائے گا۔ اب جب بھی اس کے سامنے کوئی چیز رکھی جائے گی تو وہ اس پر اس لئے غور نہ کرے گا کہ اس کے پاس تو عقل ہی نہیں ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے کی توجہ ایک خاص طرف نہیں ہوتی، اس لئے وہ اس چیز میں دل چسپی نہیں لیتا لیکن اگر کہیں آپ نے اس سے کہہ دیا کہ تجھے تو پڑھنے سے دل چسپی ہی نہیں۔ تو پھر وہ وہی دل چسپی نہ لے گا۔ کیوں کہ اس کو تو بتایا گیا ہے کہ اس کو پڑھنے سے دل چسپی نہیں ہے۔ پہلے تو یہ کیجیے کہ اس کو پڑھنے کی طرف متوجہ کر لیتے، پھر اس سے دل چسپی لینے کا مطالبہ کیجیے۔

یہ بھی نہ کیجیے کہ آپ کا بچہ ہے تو ڈیڑھ دو سال کا اور آپ اس سے سوال تین سال کے بچے کی استعداد کا حل کرائیں۔ ایسا کرنے سے بچے کے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً آپ اس سے وہی نظر والا سوال کریں گی اور وہ جواب نہ دے پائے گا، یا جب وہ آپ کی بات ہی

تہ سمجھ پائے گا تو اس کی طبیعت اچاٹ ہو جائے گی اور پھر وہ ایسی باتوں میں کبھی دل چسپی نہ لے گا۔

بچوں کو پڑھتے وقت یہ احساس نہ دلائیے کہ وہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کو اس طرح پڑھائیے کہ وہ اس میں دل چسپی لیں۔ ڈنڈے سے ٹھونک کر آپ اس کو قاعدہ یا ہاڑے توڑنا دیں گی لیکن عمر بھر وہ یہی سمجھتا رہے گا کہ یہ ایک بلا تھی جو اس کے سر سے ٹل گئی لیکن اگر اس کا ذہن خود اس طرف متوجہ ہو گا تو نہ اس میں تعلیم کی طرف سے نفرت اور خوف پیدا ہو گا اور نہ وہ اپنے ذہن کو استعمال کرتے ہوئے گھبرائے گا۔ بہت سے بچے مدرسوں میں اسی وجہ سے پیٹے جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ شروع ہی سے پڑھائی کے معاملے میں یہی برتاؤ ہوا تھا۔

اگر آپ اپنے بچے کو کوئی چیز یاد کرانا چاہیں تو یہ دیکھ لیں کہ وہ اتنی طویل تو نہیں ہے کہ بچے کے بس سے باہر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر صرف اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ سہار سکے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنے بچے پر اس کی سہار سے زیادہ بوجھ ڈال رہی ہیں۔

بچہ بہت سی الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے ابو کو بھی سمجھتا تھا کہ اس کی اُمّی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے لمحوں میں آپ اس کی صحیح رہنمائی کریں تاکہ اس کے ذہن میں کوئی گتھی نہ رہ جائے، ورنہ آپ جانتی ہیں کہ وہ نہ معلوم کیا اُٹ پٹانگ سیکھتا رہے گا۔

آخر میں ذہنی صحت کے لئے ایک بار پھر عرض کروں گا کہ آپ پہلے سے یہ یقین کر کے نہ بیٹھ جائیں کہ آپ کا بچہ بے عقل ہے، اور یہ زیادتی بھی نہ کریں کہ جہاں وہ کچھ کرنے چلے آپ اس کا راستہ روک دیں۔ آپ اس کو اپنا ذہن استعمال کرنے کا پورا پورا موقع دیں۔

## چند لفظوں میں

○ جسمانی اور ذہنی صحت کی دیکھ بھال کے بغیر بچہ ساری عمر دوسروں کا محتاج رہے گا۔

## جسمانی صحت

- پیدائش سے پہلے آپ کی صحت پر بچے کی صحت منحصر ہے۔
- پیدائش کے بعد جب تک بچے آپ کا دودھ پیتا ہے اُس وقت تک بھی آپ کو بچے کی صحت کے لئے اپنی صحت کا خیال رکھنا ہوگا۔
- بچے کی خوراک کے اوقات متفرق کیجیے۔ یہ صحت کی ضمانت ہے۔
- بچے کو ہمیشہ ایسی غذا دیجیے جس کے لئے اُس کے اندر رغبت ہو یا آپ نے رغبت پیدا کر دی ہو۔
- غذا میں اُس کی تکلیفوں اور بیماریوں کا خاص لحاظ رکھیں۔
- بچے کو دوا کا عادی نہ بنائیے۔ پہلے اُس کی فطری قوت مدافعت کو کام کرنے دیجیے۔
- لاڈ پیار میں بچے کو جسمانی محنت سے محروم نہ کریں۔
- بچے کی قوت کو آپ صحیح استعمال کا جتنا موقع دیں گی۔ اُس کی جسمانی صحت اتنی ہی اچھی رہے گی

## ذہنی صحت

- ضروری نہیں کہ آپ کا بچہ پیدائشی طور پر کم عقل ہو۔ بہت ممکن ہے کہ آپ نے اُسے اپنی عقل استعمال کرنے کا موقع نہ دیا ہو۔
- بچے کو چیزوں کے آزمانے اور جانچنے کی آزادی دیجیے اور ضرورت ہو تو اُس کی مدد بھی کیجیے۔
- بچے کی مدد کرتے وقت اُسے اس کی ناکامی کا احساس نہ دلائیے۔
- ذہنی استعداد کو بڑھانے کے لئے پہیلیاں، رشتے اور تعلقات کی تفصیل اور نلوں کے حالات وغیرہ سنائیے۔
- بچے سے کبھی یہ نہ کہیے کہ وہ کم عقل ہے۔ اس سے اُس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔
- بچے سے جو کام آپ لینا چاہتی ہیں، پہلے اُس میں اُس کی دل چسپی پیدا کریں، خواہ

تعلیم ہی کیوں نہ ہو۔

- بچے کی ذہنی مشغولیت میں اُس کی عمر کا لحاظ ضرور رکھیے۔
  - کام اور ذمے داری کا احساس دلا کر بچے کا ذہن بوجھل نہ کیجیے۔
  - بچہ جب اوٹ پٹانگ سوچے تو دانش مندی کے ساتھ اس کی رہنمائی کیجیے تاکہ وہ سوچنے کا انداز بھی سیکھ جائے۔
-

# بچے کی نشوونما

اگر آپ بچے کی صحیح تربیت کرنا چاہتی تو آپ کو سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ صحیح طریقے سے اس میں پروان چڑھیں گی ہاں! اس کی صلاحیتوں کا ٹھیک طور سے پروان چڑھنا ہی اس کی صحیح تربیت ہے۔ اگر آپ نے بچے کی زندگی کے اس گوشے کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی تو پھر آپ کے لئے بڑا مشکل ہو گا کہ جس قدر صالح آپ اسے بنانا چاہتی ہیں وہ اتنا ہی صالح ہو جائے۔

لیکن یہ صلاحیتیں کیا ہیں؟ — آئیے ہم ان کو بھی پہچان لیں۔

آپ یہ تو جانتی ہی ہیں کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے روتا ہے۔ اس کا یہ رونا آپ سب کے لئے بڑی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ یہ اس کی زندگی کی علامت ہے۔ پھر جب وہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے تو وہ اپنی نظروں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ بے مقصد اپنے ہاتھ پاؤں پھینکتا رہتا ہے۔ ایسی ہی معلوم نہیں کتنی حرکتیں وہ کرتا ہے لیکن آپ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی ہیں کہ وہ فلاں فلاں حرکت کس وجہ سے کر رہا ہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد جب آپ اس کی حرکتوں سے مانوس ہونے لگتی ہیں تو آپ کو اس کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ وہ رو رہا ہے اس لئے اس کو بھوک لگی ہے یا وہ ڈر گیا ہے اور ایسی ہی تمام باتیں!

یہ حرکتیں وہ کیوں کرتا ہے؟ — کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے؟

آپ کا خیال درست ہے کہ یہ ایسی کون سی چیز تھی جس پر غور کیا جاتا۔ بہر حال

اگر آپ نے اب تک یہ سوچا تھا تو اب اپنے بچے کی ان حرکتوں پر نظر رکھیے اور ان حرکتوں کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ دیکھیے یہ حرکتیں ہی دراصل اس کی صلاحیتیں ہیں۔ اگر وہ اس طرح کی بے معنی اور غیر ضروری حرکتیں نہ کرتا ہوتا تو ذہین اور عقلمند بچہ بن کر نہ بڑھ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ زیادہ تیز روشنی کے سامنے اپنی آنکھیں بند کر لے، اس کے ہاتھ یا جسم میں کوئی چیز چبھ جائے تو وہ اپنا ہاتھ یا اپنے جسم کا وہ حصہ ہٹا لے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی تیز آواز ہو تو وہ چونک پڑے یا رو دے۔ غرض اس طرح کی تمام صلاحیتیں ہی اس کی آئندہ زندگی میں اس کے علم، اس کے غم و غصہ اور اس کی عادات و اخلاق کا حصہ بنتی ہیں۔

مجھے آئندہ صفحوں میں انہی باتوں کے بارے میں کہنا ہے اور یہ بھی بتانا ہے کہ اس کے جذبات اس کی بول چال اور اس کے رہن سہن میں آپ شروع ہی سے ان باتوں پر غور کر کے کس طرح اس کو سدھار سکتی ہیں؟ اور ان کی طرف سے کیسے بے پروائی بچے کے لئے مضر ہوتی ہے؟

## جذباتی نشوونما

آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ آپ کا یہ چھوٹا سا معصوم بچہ جس کی عمر مشکل سے سال دو سال کی ہے، شوخ رنگوں کو دیکھ کر ان کی طرف پکتا ہے۔ اس لمحہ اس کے چہرے سے خوشی اور مسرت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح جب بڑے دھماکے کی آواز ہوتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے، اور بعض اوقات تو رونے بھی لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب وہ کسی موقع پر آپ کی چینی کی پرچ کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے تو آپ احتیاط کے خیال سے اس سے وہ پرچ چھین لیتی ہیں اور وہ محل کر رونے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے چہرے بٹری سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ اور ایسی ہی متعدد حالتوں کا اظہار آپ نے اپنے بچے کے چہرے پر اکثر دیکھا ہوگا اور اگر آپ یاد کرنے کی کوشش کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایسا ہمیشہ ہی ہوتا

ہے اور ہر بچے کے معاملے میں ہوتا ہے۔ ہر بچہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے، ہر بچہ خوف کھاتا ہے اور ہر بچے کا چہرہ خوشی سے دسکنے لگتا ہے۔

یہی بچے کے جذبات ہیں اور یہی سب ہم آپ میں بھی ہیں۔ ہم بھی ہر ایسی بات سے خوش ہوتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہے۔ ہم بھی اکثر ایسی چیزوں سے خوف کھاتے ہیں اور اکثر چیزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن اکثر بہنیں ایسی بھی ہیں جن کو اچھی بات بھی پسند نہیں آتی، جو مکرٹے سے بھی خوف کھاتی ہیں، اور جو ہر بات میں کیڑے نکالتی ہیں۔ ایسی عورتوں سے کون خوش رہتا ہے؟ جب بھی آپ کا واسطہ کسی ایسی عورت سے پڑ جاتا ہوگا تو آپ کی طبیعت بھی بو جھیل ہو جاتی ہوگی اور جب تک وہ موجود رہتی ہوگی ان کی وجہ سے ساری محفل کے رنگ میں بھنگ پڑ جاتا ہوگا۔

لیکن غور کیجیے، کیا ان میں نئی چیز پیدا ہو گئی ہے؟ کیا ان میں کچھ اور نئے جذبات کا اضافہ ہو گیا ہے؟ شاید نہیں!۔ جی بلکہ قطعاً نہیں۔ ان میں بھی خوف کا جذبہ ہے اور بے خوفی کا جذبہ بھی ہے، ان میں بھی خوشی کا جذبہ ہے اور غم کا جذبہ بھی۔ وہ بھی پسند کا جذبہ رکھتی ہیں اور ناپسندیدگی کا بھی۔ پھر یہ کیا بات ہے جو وہ عجوبہ نظر آتی ہیں؟ وہ کیوں دنیا بھر سے ترائی ہو گئی ہیں۔؟

اس نرالے پن اور عجبیگی کا جتنا کھوج آپ لگائیں گی بات صاف ہوتی چلی جائے گی اور آپ جان جائیں گی کہ ان میں کچھ ان جذبات کو ابھرنے کا زیادہ موقع ملا ہے جو اوروں میں ایک حد کے اندر رہے ہیں۔

مثلاً ایک بچی کی ماں بجلی کی کڑک سے بہت زیادہ ڈرتی تھیں۔ جب بھی بجلی کڑکتی تھی اور وہ اتفاق سے صحن میں ہوتی تھیں تو وہ چیخ کر بھاگتی تھیں، ان کی بچی یہ حرکت دیکھ کر کچھ سمجھ نہ سکتی تھی۔ بس اگر وہ کچھ سمجھ سکی تو صرف یہ کہ جب آسمان پر ایک مخصوص طرح کی روشنی ہوتی ہے اور زور کی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں چیخ مار کر بھاگتی ہے اور کمرے وغیرہ میں چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے وہ بھی یہی کرتی رہی اور جس طرح ماں کے دل میں بجلی کی کڑک سے خوف تھا

اسی طرح اس کے اندر بھی خوف پیدا ہو گیا۔

مگر اس بچی میں جو یہ خوف پیدا ہو گیا، پہلے سے تو تھا نہیں۔ اس مخصوص چیز کی طرف سے خوف پیدا کرنے کی فتنے دار صرف اس کی ماں تھی۔ یہی حال بالکل اس عورت کا بھی ہے جس کا میں تذکرہ کر رہا تھا اور جس کی نرالی طبیعت پر ہر ایک ہی متنگلی اٹھاتا ہے۔

لیکن اس بات کو بھی اچھی طرح دھیان میں رکھیے کہ آپ جذبات کو بچے سے الگ نہیں کر سکتیں۔ جو عورتیں یہ کہتی ہیں کہ ان کے بچے میں خوف کا مادہ ہی نہیں، یا وہ غصہ لے کر پیدا ہی نہیں ہوا ہے، وہ غلط کہتی ہیں۔ بھلا یہ کہیں ہو سکتا ہے کہ بچہ اپنی پسند یا ناپسند سے محروم ہو جائے۔ اگر یہ چیزیں ایک بچے کے اندر سے ناپید ہو جائیں تو وہ بچہ یا تو زندہ نہ رہے گا یا پاگل ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جذبات اس لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ اپنا ایک مخصوص مزاج بنا سکے، وہ کچھ چیزوں کو پسند کر سکے اور اس پسند کی وجہ سے اس کو اپنا سکے۔ اُس میں اگر کسی چیز کی طرف سے خوف پیدا ہو تو وہ اس سے بچ سکے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے گا تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، اس لئے جذبات کے کم یا زیادہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے ہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ آپ کی تربیت اُن کو زیادہ ابھرنے یا کم ابھرنے کا موقع دیتی ہے۔

بھوکا بچہ ہمیشہ روتا ہے، اس لئے اس کو بھوکا رہنا اچھا نہیں لگتا، لیکن اگر ایسے بچے کو روتا ہی چھوڑ دیا جائے تو وہ اس حد تک روئے گا کہ آپ جھنجھلا کر اٹھیں اور اسے پیٹ ڈالیں، یا پھر وہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا، یا اپنی بھوک کا کوئی اور علاج کرے گا، پوری کر کے یا گرمی پڑی غلیظ چیزیں کھا کر اپنی بھوک مٹائے گا۔

اسی طرح آپ شاید اس ماں کو بھی نہ سزا ہیں جو اپنے بچے کے غصے کا تذکرہ ہنس کر اس طرح کرے کہ ”اُس کا غصہ تو بالکل اُس کے باپ جیسا ہے“۔ بچے پر اس کا اثر کیا ہوگا؟ یہی نا کہ وہ اس کو اپنی خوبی سمجھے گا اور باپ سے بھی دو ہاتھ آگے



بخل جانے کی کوشش کرے گا۔

بہر حال جو بات میں بتانا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ آپ بچے کو جذبات کے اظہار کا اچھا موقع دیں۔ اظہار کا اچھا موقع ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اس میں غصہ زیادہ ہے تو سزا دے کر غصہ چھڑانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ جس وقت غصہ ہو اُسے دوسرے کاموں میں لگا دیں۔ بچوں کے جذبات کو اُن کے کھیل کود میں استعمال کریں۔ انہیں نئی نئی چیزیں اور دستکاری وغیرہ کا موقع دیں۔ اُن کو اس طرح مصروف رکھیں کہ ان کا ذہن بے کار نہ رہنے پائے، وہ لڑنے جھگڑنے کا موقع نہ پائیں، بلکہ وہ خود بخود ہی اپنے کاموں میں دل چسپی لینے لگیں۔ اس کی تفصیل انشا انشا آئندہ آئے گی۔ فی الحال آپ یہ ذہن نشین کر لیں کہ احتیاط علاج سے بہتر ہے۔ اس لیے آپ بھی اپنے بچے کے جذبات کے معاملے میں احتیاط سے کام لیں، علاج کا انتظار نہ کریں۔

## حسی نشوونما

بچوں کی پسند بڑی بڑی ہوتی ہے، اتنی بڑی ہوتی ہے کہ بعض وقت اُن کی سادگی پر ہنسی آتی ہے۔۔۔ دیکھیے نا، کبھی تو اُن کی جیبیں لال، پیلے، نیلے شیشوں سے بھری رہتی ہیں اور کبھی کنکر پتھر سے کبھی وہ لوہے، پیتل اور ٹین وغیرہ کے ٹکڑے جمع کرتے پھرتے ہیں اور کبھی جب دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں تو پیسیوں کے عجب عجب ٹکڑے جمع کر لاتے ہیں۔ غرض ان کا خزانہ ہمیشہ ہی اتنا عجیب ہوتا ہے کہ اگر وہ آپ کی موجودگی میں کسی غیر کے سامنے پھیلا کر رکھ دیں تو آپ شرم کے مارے پانی پانی ہو جائیں۔۔۔ مگر وہ؟۔۔۔ ان کا سینہ تو فخر سے پھول جاتا ہے۔ وہ تو یہ اُمید کرتے ہیں کہ دیکھنے والا اُن کی چیزوں کی بے انتہا تعریف کرے۔

اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ لوگ بچوں کی پسند سے کیوں عاجز آتے ہیں تو کسی میلے، یا بازار میں دیکھیے۔ کھلونے بنانے والے طرح طرح کی شوخ اور بھڑکیلی چیزیں بنا کر لاتے ہیں اور بچے ان کو دیکھ کر لپک پڑتے ہیں، مگر اُن کے سر پرست یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو پیسے کا بھینکنا

ہے۔ اس ناقص سے کاغذ کے پوتنگے میں کیا ہے عجب بھونڈے سے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ بس اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے پیسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بچہ پھلنے لگتا ہے۔ جگہ جگہ پر، قدم قدم پر آپ کو ایسے بچے مچلتے ہوئے نظر آئیں گے جن کے سر پرست بچے کی پسند پر اپنی پسند کو مسلط کرنے پر مہر ہوتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟

انہیں بچے کے اپنے احساسات کا خیال نہیں ہوتا۔ انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ جتنی اچھی طرح وہ چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، پرکھ سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں، چکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، وہ بچہ کیا، کوئی اور دنیا میں کر ہی نہیں سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ان حضرات کو نمائش میں رکھنا چاہیے۔ دنیا میں یہی ایسی ہستی ہیں جن میں کوئی خامی نہیں۔ کیسے آپ کی کیا رائے ہے ان کے بارے میں؟

دیکھیے، ہر شخص میں اپنے احساسات ہوتے ہیں، علاوہ اس کے کہ وہ قدرت کی طرف سے محروم کر دیا گیا اور یہ احساسات ہیں پانچ:

○ دیکھنے کا احساس

○ چکھنے کا احساس

○ سونگھنے کا احساس

○ چھونے کا احساس

○ سننے کا احساس

بچے میں بھی یہ سارے احساسات موجود ہوتے ہیں۔ ہر صحت مند بچہ دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، چکھ سکتا ہے، سونگھ سکتا ہے، اور چھو سکتا ہے۔ وہ لال، پیلے، نیلے رنگ دیکھ سکتا ہے اور جب اسے ایسے پیارے، پیارے رنگ دکھائی دیتے ہیں تو وہ ان کی طرف لپکتا ہے۔ خواہ وہ کاغذ کے ٹکڑے کا رنگ ہو یا کاپی کا ٹکڑا۔ وہ طرح طرح کی آوازیں سن سکتا ہے۔ خواہ وہ خالی ٹین کو پیٹ کر بے ہنگم شور پیدا کر کے ہی کیوں نہ سنے۔ وہ ہر قسم کی چیز چکھ سکتا ہے، خواہ وہ مٹی کا ٹکڑا ہی اٹھا کر منہ میں کیوں نہ رکھ

لے، اور وہ اپنے پھونے کے احساس کو آزمانے کے لئے آگ کے انکارے کی طرف بھی نپکتا ہے، اور اگر آپ اُسے گلاب کا پھول دیکھیے تو وہ اُسے بھی بڑے شوق سے سونگھتا رہے گا۔

بعض اوقات تو وہ گلاب کا سُرخ سُرخ پھول دیکھتا ہے، دیکھتے ہی اس کی طرف نپکتا ہے، اُسے ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے، مٹھی میں دباتا ہے، پھر ناک تک لے جاتا ہے اور منہ میں رکھ لیتا ہے۔

خاص طور سے وہ ہر چیز کو چکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ لیکن جب آپ اس کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو فوراً چیخ پڑتی ہیں۔ ”بڑا غلیظ ہے، کسی چیز کی تمیز نہیں!“ لیکن محترمہ! وہ تمیز حاصل کرنے کے لئے ہی تو یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

اگر بچوں کے احساسات میں یوں ہی بے جا دخل دیا جاتا رہے تو آپ دیکھیں گی کہ وہ پھر اپنے ان پانچوں احساسات پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں گے۔ بس ہر وقت وہ یہ چاہیں گے کہ کوئی اُن کو یہ بتائے کہ اس چیز کا مزہ اچھا ہے، اس چیز کا بُرا ہے۔ یہ خوشبو ہے اور یہ بدبو ہے۔ یقین کیجیے ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ نے بہت سے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ بہت گندے رہتے ہیں۔ ان کو غلاظت اور نفاس کی تمیز تو دس سال کی عمر تک نہیں ہو پاتی۔ آخر کیوں؟ اسی وجہ سے کہ اول تو اُن کے اپنے احساسات کو آزمانے کا اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ خود کچھ فیصلہ کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ دوسروں کی پسندنا پسند ہمیشہ اُن کی گردن پر سوار رہتی ہے۔

اکثر مائیں اپنے بچوں کو شروع میں جاو بے جا اپنی پسند کی رنگ برنگی چیزیں جمع کرنے سے منع نہیں کرتیں اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کرتی ہیں کہ بچے سے پوچھتی ہیں کہ وہ سُرخ کا پُخ کا ٹکڑا اُن کو کیوں پسند آیا؟۔ اب جب وہ بتلاتے ہیں کہ اُس میں سے اُن کو ہر چیز سُرخ نظر آتی ہے تو وہ اُن کے لئے ویسے ہی صاف سُھرے خوب مہورتی سے ترشے ہوئے شیشے فراہم کر دیتی ہیں۔ جب وہ ایک بھونڈا سا کھلونا پسند کر لاتے ہیں تو وہ من کے لئے ویسا ہی بہتر قسم کا کھلونا فراہم کر دیتی ہیں۔ غرض وہ

ان کے ابتدائی ناقص احساسات کو تربیت دے کر سنواریتی ہیں۔

اس سے پہلے میں آپ سے جذبات کے بارے میں تبادلہ خیال کر چکا ہوں۔ یہاں میں اشارہ کر دوں کہ جذبات اور احساسات کا آپس میں بڑا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ اگر آپ بچے کو اپنے احساسات کے پرکھنے کا موقع نہ دیں گی تو وہ جذباتی طور پر چڑچڑا اور بد دماغ ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ احساسات جتنے ہی اعلیٰ ہوں گے، جذبات اتنے ہی اچھے ہوں گے۔

آپ غور سے ان لوگوں کا جائزہ لیجیے جو غصہ کرنے والے، ڈر پوک اور بد مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی تنگ نظری ہوتی ہے۔ یہ جس چیز کو پسند کرتے ہیں بس اس پر کسی اور کی پسند کو ترجیح نہیں دیتے، اور پھر ان کی پسند ہے۔ بس کچھ نہ پوچھیے۔!

برخلاف اس کے کہ کچھ لوگوں کی پسند پاکیزہ ہوتی ہے۔ وہ بڑے فراخ دل اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ وہ جب کسی چیز کو پسند کرتے ہیں تو اس کے ہر پہلو کو پرکھ لیتے ہیں اور ان کی نظر دھوکہ کم ہی کھاتی ہے۔ پھر ان میں یہی کیا کم خوبی ہے کہ وہ اپنے احساسات کو پاکیزہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص کے لئے پسندیدہ مزاج رکھتے ہیں۔

احساسات بچے کے لئے اخلاقی، صنعتی اور ذہنی بلکہ ہر موقع پر کام آنے والی صلاحیت کا سرمایہ ہیں، اس لئے ان کا بہترین طور پر نشوونما پانا بہت ضروری ہے۔ نبی کریم کے احساسات کتنے اعلیٰ تھے، آپ اس سے ہی اندازہ کر سکتی ہیں کہ وہ صاف رہنے کی تلقین کرتے تھے، خوشبو پسند فرماتے تھے۔ ایک بار مسجد میں کسی نے دیوار پر تھوک دیا۔ آپ کا چہرہ نا پسندیدگی کی وجہ سے سُرخ ہو گیا۔ ایک صحابی بات کو تاڑ گئے۔ انھوں نے دیوار کے اس حصے کو کھرچ کر عطر لگا دیا۔ تب آپ کا چہرہ بشاش ہو گیا۔

## بول چال کی نشوونما

بچے کے اشارے بڑے پیارے ہوتے ہیں، جب اس کی ٹھوک مٹ جاتی ہے

تو وہ کتنی پیاری لے میں غوں غاں کرنے لگتا ہے اور اسی طرح جب وہ کوئی چکدار چسپنر دیکھتا ہے یا اسے کوئی بڑی رنگین سی چیز نظر آتی ہے (مثلاً جھنجھٹنا یا کھلونا) تب بھی وہ اسی طرح کی بے معنی آواز سے خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ بول سکتا تو ان آوازوں کو پیدا کرنے کے بجائے کبھی اور طرح اپنی خوشی یا غم، یا پسند اور ناپسند کا اظہار کرتا۔

کتنی معمولی سی بات ہے یہ! لیکن عام طور سے ہمارا ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ یہ بے معنی آوازیں بچے کی کوششیں ہیں۔ بول چال سیکھنے کے لئے۔ جی ہاں! یہ تو خیر ہم اکثر ہی کہہ دیتے ہیں کہ میرا بچہ باتیں کر رہا ہے، لیکن کیا واقعی اس کی غوں غاں کو ہم اس کی باتیں سمجھتے ہیں؟ ہو سکتا ہے ایسا ہی سمجھتے ہوں لیکن کبھی اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس کی ان آوازوں پر توجہ دے کر ہم اس کی ضرورت تو پوری کر دیتے ہیں، مگر پھر بھی اس کی بول چال کا حق ادا نہیں کرتے۔ دیکھیے میں بات کو اُلجھانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ ہم بچے کی اس طرح کی آوازوں پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دیتے بلکہ جس طرح بچہ مداری کی ڈگڈگی سن کر خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے اور تالیاں پیٹنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اس خوشی میں ہم اس کے ساتھ بڑا ظلم کرتے ہیں۔ جی ہاں! — ظلم! — اور ان ظلموں میں سے بڑے بڑے ظلم یہ ہیں:

- اس کے ساتھ بے کار بکواس کرتے ہیں۔
- اس کو گالیاں سُنا کر گالیاں سکھاتے ہیں۔
- اس کو تو تلی زبان سکھلاتے ہیں۔
- جب وہ تو تلا ہو جاتا ہے تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اکثر ہکلا بناتے ہیں۔
- جب وہ خراب بولی بولنے والوں کی نقل کرتا ہے تو اس کو اس سے منع نہ کر کے اسے خود بھی ویسا ہی بنا دیتے ہیں۔

جس بچے کی بول چال کے معاملے میں یہ بُدا احتیاطی کی جائے گی وہ یقیناً زبان کا خراب ہی ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے درمیان مشکل ہی سے ایسے بچے پائے جلتے

ہیں جن کی زبان بچپن میں درست ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ — آئیے ہم اس طرح معلوم کریں کہ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا چلے کہ وہ شروع دن سے کیسے زبان سیکھنا شروع کرتا ہے؟

بچہ اپنی بارہ مہینے کی عمر تک منہ سے آوازیں نکالنے میں بڑی دل چسپی لیتا ہے۔ کبھی ایک طرح کی آوازیں نکالتا ہے، کبھی دوسری طرح کی، اور اس طرح وہ کئی قسم کی آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ اس کی بعض آوازوں کو تو سن کر آپ اس کی ضرورتیں پوری کر دیتی ہیں اور بعض آوازوں کو سن کر آپ بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کھینے لگتی ہیں۔ یہی دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ بعض آوازوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے، اور ضرورت پڑنے پر انہی کو استعمال کرتا ہے۔ یہ آوازیں شروع میں تو وہ بالکل اتفاق سے ہی نکالتا ہے لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ اپنا اچھا خاصا کام نکال لیتا ہے تو وہ جس آواز سے جو کام نکالتا ہے اس کو اس چیز کا نام قرار دے دیتا ہے۔ مثلاً: 'مم'، 'لوتی'، 'اٹو'، 'چیچی' وغیرہ سے پانی، روٹی، کھانا، مٹھائی وغیرہ مراد لیتا ہے۔ اس زمانے میں اگر آپ بھی اس کے ساتھ 'مم'، 'اٹو' وغیرہ نہ بولنے لگ جائیں، بلکہ پانی اور کھانا ہی کہتی رہیں تو وہ آپ کی سی آواز نکالنے کی کوشش کرے گا، ورنہ 'مم'، 'اٹو' ہی اس کی بولی ہو جائے گی۔

اس کے بعد بچہ اٹھارہ ماہ کی عمر تک ایک ایک دو دو لفظوں کو بلا کر جملے بنانے لگتا ہے اور پہلے کی بہ نسبت بڑی جلدی چیزوں وغیرہ کے نام سیکھنے لگ جاتا ہے۔ اب اس کو ایک چیز کے دیکھنے کے بعد اس کا نام معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور جب وہ نام معلوم کر لیتا ہے تو ذرا مشکل سے بھولتا ہے۔ آپ اس زمانے میں اگر چاہیں تو اس کو بہت کم عرصے میں بہت کچھ سکھا سکتی ہیں۔ اس کو چیز دکھائیے، اور ان کے نام بتائیے، وہ ان ناموں کو یاد رکھنے کی پوری کوشش کرے گا۔ مگر سنیے! — اس زمانے میں آپ اس کو اپنی بھلائی مشین کے پڑزوں کے نام خدا کے واسطے نہ سکھلانے لگیں گا ورنہ غضب ہی ہو جائے گا۔ اچھا خیر! — بھلائی کی مشین نہ ہی

تو کسی اور ایسی چیز سے اس کو ابھی واقف کرانے کی ضرورت نہیں ہے جس میں بچے کو کوئی دل چسپی نہ ہو۔ اس کی اپنی پسند اور دل چسپی کی چیزوں کے نام اس کو بتائیے۔ جب بچہ کچھ چیزوں کے نام جان جاتا ہے تو وہ اُن کے لئے اشارے کرنے کے بجائے ان ناموں کو استعمال کرنے لگتا ہے اور آپ کے لئے اس کی باتوں کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس زمانے میں آپ کو ان دو باتوں کی احتیاط خاص طور سے رکھنا پڑے گی پہلی یہ کہ آپ اس کو تو تلی زبان میں کسی چیز کا نام نہ بتائیں ورنہ وہ تو تلا ہو جائے گا، اور دوسرے یہ کہ کانوں میں گالیوں اور فحش لفظوں کو نہ پڑنے دیں۔ کیوں کہ اس زمانے میں اس کو سیکھنے کا بوشوق ہوتا ہے وہ بڑی جلدی یہ سب کچھ سیکھا دیتا ہے۔ اکثر مائیں جب اپنے بچوں کی تو تلی زبان سے گالیاں سُنتی ہیں تو اُن کو بڑا لطف آتا ہے۔ وہ اسے بار بار کہنے پر اُکساتی ہیں اور اس طرح وہ اُن کا دل خوش کرنے کے لئے اور اُن کا پیار حاصل کرنے کے لئے بھی گالیاں ہی سیکھنا شروع کر دیتا ہے، اور وہ یہ سب کتنی جلد سیکھ جاتا ہے، اپنے ایک چشم دید واقعے کے ذریعے آپ پر واضح کرتا ہوں :

میں ایک دن ایک سڑک پر سے گزر رہا تھا، دو بچے آپس میں جھگڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک بچے نے اپنے کو کمزور محسوس کیا۔ چناں چہ اس نے دوسرے بچے کو ماں کی گالی دی، اور بھاگ گیا۔ پاس ہی سے ایک تین چار سال کی بچی گزر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں یہ گالی پڑی اور وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی تو تلی زبان میں اس گالی کو گانے لگی۔ بالکل جیسے وہ بھی کوئی فلمی گانا ہو۔ اور فلمی گانے کو ن سے فحش گالیوں سے کم ہوتے ہیں۔

غرض ایسی زبان سے بچے کو بچائیے۔ کیوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز سے انتہائی نفرت کی ہے اور اسے منافقوں کی ایک پہچان گردانا ہے۔  
ملاحظہ ہو وہ حدیث یہ ہے :

”حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس میں چار نصلتیں ہوں وہ خاص منافق ہے اور جس میں ان میں کی ایک نصلت ہوگی تو وہ بھی منافق ہی کی نصلت ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے۔ علامتیں یہی ہیں: جب بات کہے جھوٹ کہے، وعدہ کرے وفانہ کرے، امانت میں خیانت کرے اور جب لڑے تو گالی دے!“

(مسلم، بخاری)

رہ گیا یہ کہ منافق کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا انجام ہوگا؟ تو صرف یہی ذہن میں محفوظ کر لینا کافی ہے کہ وہ دوزخ کا کندہ بنے گا، اور اس کے لئے ہم اپنے عزیز کیا دشمنوں کے واسطے بھی تمنا نہ کریں گے۔ ہماری خواہش تو یہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ہدایت دے اور راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس لئے آپ اپنے بچے کو اللہ تعالیٰ کے دین اور اس سے متعلق پاکیزہ امور کے بارے میں واقف کرائیے۔ اس کو ایسے نام سکھائیے اور چیزوں کی شناخت کرائیے جو اس کی اخلاقی اصلاح کے لئے مفید اور مددگار ہوں۔ آپ کا یہ عمل اس کے لئے اُس وقت اور بھی مفید ہوگا جب وہ دو دو تین تین حروف کے جملے بنانا شروع کر دے گا، اور ان سے اپنی کسی نہ کسی خواہش اور ضرورت کو وابستہ کر دے گا۔ وہ اب آپ سے کہنے لگے گا ”مم پیس“ ”لوتی کھائیں“ ”بھجی لاؤ“ وغیرہ وغیرہ۔ آپ اس کی بہت کچھ باتیں سمجھنے لگیں گی۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ آپ یہ بھی جاننے لگیں گی اور اکثر جب آپ اپنی مرضی کے جملے اس سے کہلانا چاہیں گی تو وہ آپ کی خوشی کے لئے اور آپ کا پیار حاصل کرنے کے لئے انھیں بھی ادا کرنے لگے گا۔ ایسے زمانے میں آپ کی مرضی کیسا ہونی چاہیے؟ — وہی جو ہم سب کے خالق و مرنی کی مرضی ہے۔ اس لئے آپ اس کی بول چال کی قوت میں اضافہ کرنے کے لئے اس اعلیٰ و افضل مرنی کی مرضی کا خیال رکھیں۔

اس کی یہ تربیت آپ کس عمر میں کرتی ہیں؟ — جب کہ وہ اٹھارہ ماہ سے لے کر دو سال کا عرصہ طے کرتا ہے۔ اور جب اُس کے الفاظ اتنے صاف نہیں ہوتے جتنے آئندہ دو سال سے لے کر ڈھائی سال تک کی عمر میں ہوتے ہیں۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں



زیادہ صاف بولنے لگتا ہے لیکن اس کی بولی اتنی صاف نہیں ہوتی کہ ہر ایک آسانی کے ساتھ سمجھ لے، بلکہ اس کے قریبی عزیز جن سے اس کا رات دن کا سابقہ رہتا ہے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، مگر اس زمانے میں وہ پہلے کے مقابلے میں اور بھی کچھ زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ ہر بات پر سوال کرتا ہے۔۔۔ وہ ”کیوں؟“ ”کیا؟“ اور ”کیسے؟“ کی بھرمار کر دیتا ہے۔ آپ اس سے کہتی ہیں ”کپڑے پہن لو“ اور وہ سوال کرتا ہے ”کیوں؟“ آپ کہتی ہیں ”تم ننگے ہو“ اور پھر وہ پوچھتا ہے ”کیوں؟“ آپ پھر اس کو سمجھانا چاہتی ہیں اور کہتی ہیں ”دیکھو یہ نئی قمیص کتنی اچھی ہے“ اور وہ پھر پوچھتا ہے ”کیوں؟“ آپ کو اس کے یہ سوال بڑے بے متکے لگتے ہیں اور آپ اس کو ڈانٹ دیتی ہیں یا پھر مار دیتی ہیں لیکن کیا یہ صحیح طریقہ ہو اس کے سوالوں کے جواب دینے کا؟ آپ کو تو اس کے ہر سوال کا جواب دینا چاہیے تھا، اور اس کو مطمئن کر دینا چاہیے تھا۔ اگر آپ اس کی عمر کے اس زمانے میں رُکاوٹ پیدا کریں گی تو وہ نہ تو جلد بولنا سیکھ سکے گا اور نہ اپنی معلومات میں ہی اضافہ کر سکے گا۔ بس بالکل بدھو ہو کر رہ جائے گا۔

یہ وجہ معلوم کرنے کا شوق اور یہ ”کیوں“ کی بھرمار آئندہ ڈھائی سال کی عمر میں اور بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ اب وہ چیزوں کے نام سیکھ چکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے بول کر اپنا کام چلانا جان چکتا ہے، اور اب اس کے لئے جو بات باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ اپنی سمجھ بوجھ میں اضافہ کرے اور اس اضافے کے لئے وہ سوالات کر کے اپنی کمی کو پورا کرنے لگتا ہے، لیکن جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، اگر اس کے سوالات کے پورے پورے، ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیئے جائیں گے تو اس کی سمجھ بوجھ میں بھی اضافہ نہ ہو سکے گا۔ اس زمانے میں بچے کہانیوں، قصوں اور واقعات میں بڑی دل چسپی لیتا ہے۔ اگر اس کو نمبروں، صحابیوں اور ایسی ہی دوسری معزز، مستیوں کے واقعات و حالات بتائے جائیں اور پُر اثر اخلاقی و اصلاحی قصے سنائے جائیں تو وہ صحیح زبان، تجربہ اور دل چسپی کے ساتھ ساتھ صالح سمجھ بوجھ بھی پیدا کر سکے گا۔

بچے اکثر بول چال سیکھتے سیکھتے اپنے اسی مقام پر رُک جاتا ہے جس پر وہ ایک عرصے

سے ٹھہرا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ تین چار سال کی عمر کے بعد کچھ زیادہ صاف نہیں بول سکتا اور ماں باپ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ پھر کسی سے خراب زبان سیکھ آیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنے پُرانے خزانے کو محفوظ کرنے میں لگا ہوتا ہے۔ وہ اب تک جو کچھ سیکھ چکا ہے اس کو یاد کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں بولنے، بات کرنے میں اس کی دل چسپی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ بھی اکتا جائے گا اور جتنا کچھ وہ سیکھ چکا ہے اسی پر بھروسہ کر لے گا۔

بول چال سیکھنے کے بارے میں ایک بات مجھ کو یہ اور کہنی ہے کہ آپ جہاں اس کی صاف ستھری بولی کا خیال رکھیں وہاں صالح تعلیم کا بھی خاص خیال رکھیں۔ اس کے سامنے ایسی زبان کا نمونہ پیش کریں جو ایسی ہو کہ اگر بچہ اس کو سیکھ جائے تو بعد میں آپ کو سختی کے ساتھ اس کو چھڑانا نہ پڑے۔ اچھے والدین اس پر بڑا دھیان رکھتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے والد انھیں کبھی غلط جملے نہ بولنے دیتے تھے اور ہمیشہ صحیح لفظ ادا کرنے کا شوق دلاتے تھے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ہمیشہ بڑی سادہ اور صاف بول چال کی زبان کے عادی رہے اور اپنی دانست میں غلط زبان استعمال نہیں کی۔

## چنی نشوونما

جب آپ کا بچہ آپ سے سوال کرتا ہے "میں لڑکا کیوں ہوں؟" یا "اچھی لڑکی کیوں ہے؟" یا یہ کہ "میں کیسے پیدا ہوا؟" تو آپ اس کو یہ حقیقت کھل کر بتانے میں بڑی رکاوٹ محسوس کرتی ہیں اور عجیب الجھن میں پھنس جاتی ہیں۔ اگر آپ اس کو سب کچھ من و عن بتا دیتی ہیں تو وہ بڑی خراب باتیں جان جاتا ہے اور اگر آپ نہیں بتاتی ہیں تو وہ ہر دو چار دن کے وقفے کے بعد پھر یہی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے قبل میں بیان کر چکا ہوں کہ بچہ جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ کس لئے ہے؟ اور کیسے ہے؟ یہی تلاش و جستجو اس موقع پر بھی اپنا کام کرتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ "اچھی" کے تو بے بال رکھے

جلتے ہیں مگر اس کے بالوں کو نائی سے کتر وادیا جاتا ہے۔ ”اچھی“ کو گڑیاں کھیلنے کے لئے دی جاتی ہیں اور وہ جب گھر وندے کے پاس جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ارے کیا تو لڑکی ہے؟“ اور پھر جب کوئی بات آتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے۔ ”لڑکے ایسا نہیں کرتے! یہ تو لڑکیوں کے کام ہیں۔“ ایسی باتوں کو سن کر وہ خود عجب الجھن میں پھنس جاتا ہے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ آخر وہ لڑکا کیوں ہے؟ اور ”اچھی“ لڑکی کیوں ہے؟ اور جب اس کے ختنہ کا ذکر آتا ہے یا جب اس کا ختنہ ہوتا ہے اور اس تکلیف سے وہ دوچار ہوتا ہے تو یہی گمان کرتا ہے کہ ”اچھی“ کو بھی اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن جب اس کی نظر اس حقیقت کو کھول کر رکھ دیتی ہے کہ اس کے لئے ایسی کوئی ضرورت نہیں تو وہ ایک اور الجھن میں پھنس جاتا ہے اور آخر وہ آپ سے پوچھ ہی بیٹھتا ہے۔ ”امی!.....“ اور آپ بڑی جزبر ہو جاتی ہیں۔ ————— ”بہت عادتیں خراب ہو گئی ہیں اس لڑکے کی! معلوم ہوتا ہے یہ بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا ہے؟“ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی بنا پر اس کے لئے ایسے سوالات پوچھنا لازمی ہے اور اگر وہ نہیں پوچھتا تو وہ یا تو غور و فکر نہیں کر رہا ہے یا آپ کے غضب سے خائف ہے۔ بہر حال یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس کا تقریباً ہر ماں کو سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن عام طور سے اپنی شرم کا اس قدر مظاہر کیا جاتا ہے کہ بچے بجائے اپنی الجھن سے نجات پانے کے اور بھی زیادہ الجھاؤ میں پڑ جاتا ہے، اور پھر وہ غلط طریقوں سے اپنی الجھنوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہیں سے بچے بگڑ جاتا ہے۔

مگر آپ اپنے بچے کو بگاڑنا نہیں چاہتیں۔ اس لئے آپ کے لئے تو یہ الجھن اور پیدا ہو گئی کہ اس کے ان سوالوں کا جواب کیوں کر دیا جائے؟ اور اگر دیا جائے تو کیسے اُسے ان حقیقتوں کے علم سے محفوظ رکھا جائے جن کی اُس کو اس عمر میں ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے یہاں ————— یعنی ہندوستانی گھرانوں میں ————— بچے کو جس طرح ان حقیقتوں سے آگاہ کیا جاتا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہیں:

○ جب وہ ایسے سوال کرے تو اس کو جھڑک دیا جائے یا منزادی جائے۔

○ جب وہ ایسے سوال کرے تو غلط سُلط جُواب دے کر اس کو خاموش کر دیا جائے۔

○ جب وہ ایسے سوال کرے تو بلا جھجک بتا دیا جائے۔

لیکن غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کوئی طریقہ بھی صحیح نہیں ہے ان کے ذریعے تو بچہ اور بھی زیادہ خراب ہو جائے گا۔ اس میں بُرائی اور بھی زیادہ جڑ پکڑ لے گی اور وہ آخر کار ایک لُچا اور شہدہ بن کر رہ جائے گا جس کے لئے شاید کوئی ماں تیار نہ ہو۔ مگر وہ بے چاری اپنی لاعلمی میں یہی غلطی اور کوتاہی کرتی ہیں۔ فرض کیجیے اگر بچہ اتنا زیادہ خراب نہ بھی ہونے پائے تو بھی اس میں کم از کم اتنی خرابی تو ضرور پیدا ہو جائے گی کہ وہ جنسی معاملات میں بے انتہا دل چسپی لینے لگے گا اور اپنے شباب کے زملنے میں وہی گناہ گاری سیکھ لے گا جو آج کل بے حد عام اور ہر طبقے کے گھرانوں میں رائج ہے لیکن ہماری آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب ایسا سانحہ پیش آ جاتا ہے اور ہم کف افسوس ملتے ہیں۔ مگر اب پچھتانے سے کہا ہوتا ہے؛ اس کا وقت تو وہی تھا جب اس نے جنس کے بارے میں سوالات پوچھنے شروع کر دیے تھے۔

بہر حال ایسے واقعات کو دھیان میں رکھ کر آئیے ہم دیکھیں کہ ان تینوں طریقوں میں سے کسی بھی ایک طریقے کو کیوں نہیں اختیار کر سکتے۔

آپ کے دل میں کسی ایک چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے اور آپ کو جھڑک دیا جاتا ہے تو آپ کا اشتیاق ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آپ اس کے بارے میں معلوم کرنے کے دوسرے ذرائع اختیار کرتی ہیں اور معلوم کر کے ہی پھوڑتی ہیں۔ مثلاً آپ کے شوہر کے نام کوئی خط آتا ہے۔ آپ پوچھتی ہیں کہاں سے آیا ہے؟ اور وہ جھڑک دیتے ہیں۔ "تم سے مطلب ہے؟" آپ کو اس جُواب پر بڑا غصہ آتا ہے۔ آخر آپ نے کون سی خطا کی تھی اور ہاں آخر یہ راز کیا ہے جو آپ کو بھی تاریکی میں رکھا جا رہا ہے چنانچہ جب وہ اپنے آفس بکس میں لے مقفل کر کے چلے جاتے ہیں تو آپ دوسری کنجی لگا کر اسے نکال لیتی ہیں۔ خوب اچھی طرح پڑھتی ہیں اور اسی طرح مقفل کر کے رکھ دیتی ہیں اور اپنے کام میں لگ جاتی ہیں۔ خط میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی، معلوم نہیں کیا دماغ میں آگیا جو ذرا سے

سوال پر چڑ گئے۔ اگر پہلے ہی بتا دیا ہوتا تو آپ کو یہ حرکت کیوں کرنا پڑتی؟ مگر کیا کیا جائے، ان کے جھڑک دینے سے آپ کو ایسا کرنا ہی پڑا۔

بالکل یہی کیفیت اس ننھے کی ہوتی ہے جس کو آپ اس کے سوالوں پر جھڑک دیتی ہیں یا سزا دیتی ہیں۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلے تو یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ یہ کوئی جرم ہے جو اس سے چھپایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ معلوم نہیں اس میں کیا راز ہو گا جو اس سے چھپایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس خط کے معاملے میں آپ کو جتنے کچھ جرم کرنے پڑے تھے اتنے ہی یا اس سے کم زیادہ وہ بھی کرتا ہے۔ وہ دوسرے بڑے لوگوں سے حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑے لڑکوں سے طرح طرح کی نازیبا حرکتیں سیکھ لیتا ہے اور کجروی اس کے اندر پرورش پانے لگتی ہے۔

اسی اندیشے کی بنا پر کچھ لوگوں نے نہ معلوم کیوں یہ سوچ لیا ہے کہ اگر بچے کو غلط سنط خواب دے دیے جائیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا اور پھر جب بڑا ہو گا تو سب کچھ خود ہی جان جائے گا۔ مثلاً اگر آپ کے شوہر اس خط کے بارے میں کہہ دیتے کہ فلاں دوست کا ہے، خیریت سے آگاہ کیا ہے تو آپ کو پھر چڑا کر اسے پڑھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن اگر کسی دوسرے وقت آپ کی نظر اس خط پر پڑ جاتی اور آپ کو معلوم ہوتا کہ خط تو ہمیں اور سے ہی آیا تھا اور تھا بھی کسی اور معاملے کے بارے میں، آپ کو بلاوجہ دھوکے میں رکھا گیا تھا۔ آپ کم از کم خط کے معاملے میں ان کا اعتبار کرنا چھوڑ دیں گی اور جب بھی کوئی خط آئے گا تو خود دیکھنے کی کوشش کریں گی۔ یہی حال اس بچے کا ہوتا ہے جس کو بے بنیاد باتیں بتائی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ پوچھتا ہے۔ ”ستی کہاں سے آئی؟“ اور آپ کہہ دیتی ہیں ”دائی لائی تھی“ لیکن پھر جب خاندان میں کوئی اور بچہ ہونے والا ہوتا ہے اور اتفاق سے دائی اس کی موجودگی ہی میں آتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ وہ تو خالی ہاتھ آئی ہے۔ لیجئے یہیں سے آپ کا اعتبار اٹھ گیا۔ اب وہ خود معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ آخر یہ بچے کہاں سے جاتے ہیں اور پھر وہ یہ بھی دوسروں سے جاننے کی کوشش کرے گا کہ ختنہ کیوں ہوتا ہے؟ شادی کیوں ہوتی ہے؟ لڑکی کیسا ہے؟ لڑکی لڑکے کیوں اور کیسے ہوتے ہیں اور پھر ان

کبھی وہی حشر ہوتا ہے جو ان بچوں کا ہوتا ہے جنہیں کسی طرح کی سلووات فراہم نہیں کی جاتیں۔ ان دونوں طرح کی خرابیوں سے بچنے کے لیے مغرب والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بچے کو جنس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جائے اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ رکھا جائے کیوں کہ جب وہ سب کچھ جان جائے گا تو اس کی تلاش و جستجو کا اشتیاق بھی ختم ہو جائے گا اور پھر اس کے لیے اس طرح کے سوالات کوئی معنی نہ رکھیں گے اور نہ کوئی ایسا سوال ہی ان کے ذہن میں ابھرے گا۔ چنانچہ وہ لوگ جن کا ایمان مغرب پر ہے اور وہ وہاں کی ہر چیز کی نقل کرنے میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں، انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب ان کے بچے خراب نہ ہوں گے مگر آپ روزانہ دیکھتی ہیں کہ جس قدر فحاشی اور آوارگی ان گھرانوں میں بڑھ رہی ہے۔ اتنی شاید ہی کسی اور خاندان اور گھرانے میں ہو۔ ان گھرانوں کے بچے روزانہ اپنی نظروں سے بڑوں کی بے حیائی دیکھتے ہیں اور وہی کچھ ان سے سیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں ریڈیو، سینما، ٹی وی، ویڈیو، آڈیو کیسٹ اور ناچ گانے اس میں اور بھی اضافہ کرتے رہتے ہیں اور جب جوان ہو جاتے ہیں تو اسی طرح پینگیں بڑھاتے ہیں جس طرح ان کے والدین نے کیا ہوگا۔ لیکن یہاں ان گھرانوں میں اس کی پروا کس کو ہوتی ہے؟ یہ تو ان کی نظر میں فیشن ہے۔ البتہ اگر ان کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی جائے تو وہ بھی اس تعلیم سے شاک ہی نظر آئیں گے۔

مغرب میں اس تعلیم کی وجہ تو یہ ہے کہ ان کے یہاں حیا اور عصمت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ ان کے یہاں تو آزادانہ جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں اور زنا اور عروسی میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس کی جاتی۔ آپ آج بھی بچوں کے لئے وہاں کے انگریزی رسالے اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو کم از کم دو ایک عشق و محبت کی کہانیاں ضرور نظر آجائیں گی۔ ان کا اثر بچوں کے ذہن پر کیا ہوگا۔ آپ خود سوچ سکتی ہیں۔ البتہ میں یہ اور عرض کر دوں کہ ان کے یہاں اس طرح کی حرکات روزمرہ کی عادت بن چکی ہیں اور اسی وجہ سے ان کے یہاں جس قدر جنسی بے راہ روی اور فحاشی پھیل رہی ہے اور انھیں اس کے جتنے بڑے اثرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ ان کی پریشان حالی کو ظاہر کرتا ہے۔

ہمارے اپنے مقصدِ حیات کے لحاظ سے اتنی بے حیائی اور جنسی بے راہ روی پسند نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں تنبیہ کی ہے۔ اس سے آپ بہ خوبی یہ اندازہ کر سکتی ہیں کہ ہمارے لئے یہ بد احتیاطی کس قدر تباہی کا باعث ہوگی:

”جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ میں بے حیائی کی اشاعت ہو

ان کے لئے دُنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔“

(النور۔ آیت ۲)

جنسی تعلیم کے اس طریقے میں جو سب سے بڑی خرابی ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ بچے کے سامنے سب کچھ کھول کر رکھ دیں گی تو اس کا تجسس ختم نہ ہو گا بلکہ وہ اس سے بھی اگلا قدم اٹھانے کی کوشش کرے گا، اور وہ ہے عملی تجربہ! یعنی آپ نے جو کچھ اُسے بتایا ہے وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ آپ کبھی بھی بچے کی حرکات پر غور کر کے دیکھ لیجیے کہ بچے کے ہاتھ جنسی بھی نئی چیزیں لگتی ہیں وہ انھیں اچھی طرح آزما کر دیکھتا ہے۔ آپ روزانہ دیکھتی ہیں کہ جب بچے کو نیا کھلونا دیا جاتا ہے تو وہ اس سے بڑی دل چسپی کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ اسے رکھتا اٹھاتا ہے، توڑتا پھوڑتا ہے اور پھر ایک وقت وہ آجاتا ہے جب اس کی طبیعت بھر جاتی ہے اور وہ پھر نئے کھلونے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ اب دیکھیے کہ وہ کھلونے کے ساتھ عملی دل چسپی کتنی لیتا ہے اور جب وہ ایک کھلونے کے ساتھ اتنی دل چسپی لیتا ہے تو کیا اس کتھی کے بارے میں کچھ نہ کرے گا جو اس کے ذہن میں برقرار رہتی ہے۔ وہ یقیناً اس کے عملی پہلو سے بے نیاز نہ رہے گا، اور سب کچھ کر گزرے گا۔ چنانچہ جن گھرانوں میں یہ طریقہ رائج ہے وہاں کے بچے اسی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں۔

ان سب خرابیوں سے آگاہ ہونے کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے بچے کے لئے ان میں سے کوئی بھی طریقہ اختیار نہ کریں گی۔ آپ تو یہ چاہیں گی کہ آپ کا بچہ اس مخصوص ٹھن کے سلسلے میں غلط راہ پر نہ پڑ جائے، کیوں کہ اگر ایسا ہو گیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کا مستحق ہو جائے گا اور یہ شاید کسی کو بھی پسند نہ ہو۔ اس لئے آپ جنسی معلومات کے سلسلے میں اس چیز کا خیال رکھیں کہ نہ تو وہ آپ کی طرف سے نا اُمید ہو کر دوسرے غلط ذریعے تلاش کرے،

اور نہ آپ ہی اس کو ایسی باتیں بتائیں کہ جب اس کو اصل حقیقت معلوم ہو تو آپ کا اعتماد اٹھ جائے اور بالکل اسی طرح آپ نہ اس کو اتنا سب کچھ بتادیں کہ بس اس کے لئے عملی پیش قدمی ہی باقی رہ جائے۔

جنسی معاملات میں اس کو معلومات بہم پہنچانے کے لئے آپ جس سب سے بڑے اصول کا خیال رکھیں وہ یہ ہے کہ آپ اُس کو صرف اس قدر بتائیں جتنی معلومات کی اُس کو ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت میں ایک بچی کی اُلجھن کو بیان کر کے کرتا ہوں:

اس بچی کو یہ بتا رکھا گیا تھا کہ اُس کے گھر میں ”منٹی“ آندھی کے ساتھ آئی تھی لیکن یہ صحیح بات تو تھی نہیں اور تھوٹ بولنے والے کو حافظہ بھی نہیں ہوتا، اس لیے ایک اور وقت میں اس سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اُسے نرس لائی تھی۔ اب وہ ان میں سے کس بات کو سچ مانے اور کس بات کو تھوٹ؟ یہ اُلجھن اُس کے ذہن میں کافی عرصے تک رہی اور جب تب وہ ”منٹی“ کی آمد کے بارے میں پوچھتی رہی، حُسن اتفاق، کہ ایک دن مجھے بھی اس کے ان سوالوں کا سامنا کرنا پڑا، اور میرے لئے بھی یہ بڑا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا کہ میں اسے کیسے سمجھاؤں؟ اور پھر وہ بھی ایک بچی کو! مجھے یکایک خیال آیا کہ وہ مرغیوں میں بڑی دل چسپی لیتی ہے اور اس نے چوزوں کو انڈے سے نکلنے ہوئے اکثر دیکھا ہے۔ اس لئے میں نے اُس سے اس طرح گفتگو کی:

”بتاؤ بھلا، انڈے سے بچہ تو پیدا ہوتے دیکھا ہی ہوگا۔“

اس نے کہا۔ ”ہاں، ہاں۔“

”تو بولو، اس میں کیسے بچہ بن گیا۔؟“

”الٹریاں نے بنا دیا۔“

”تو پھر منٹی کو بھی الٹریاں نے بیٹ میں بنا دیا۔“

”مگر منٹی پیدا کیسے ہوئی؟“

”جس طرح انڈا مرغی سے پیدا ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

میری گفتگو سے وہ اس قدر مطمئن ہو گئی کہ پھر اُس نے اس بارے میں کوئی



سوال نہیں کیا، اور نہ ایسا کوئی سوال اُس کے ذہن میں اُٹھنا چاہیے بہت ممکن ہے کہ میرا یہ طریقہ کامیاب نہ ہو، مگر اتنا ضرور ہے کہ میں نے اپنی حد تک اس کے ذہن کو ان تفصیلات میں جانے سے بچا لیا جن کی اس کو ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال اگر آپ اس سے بھی بہت۔ طریقہ سے اس کی اُلجھن کو دور کر سکیں تو یہ اس کے حق میں بے حد اچھا ہوگا۔

ہمارے گھرانوں میں جہاں ایک طرف جنس کے معاملے میں تعلیم صحیح نہیں دی جاتی وہاں اس کے ساتھ چند ایک ایسی حرکتیں بھی کی جاتی ہیں کہ بچہ لامحالہ اس طرف تلاش و جستجو کے لئے مائل ہو جاتا ہے۔

ایک بچے سے عام طور پر اس طرح چھیڑ چھاڑ کی جاتی تھی کہ اس کے صنفی عضو کے بارے میں اس سے مذاقاً گفتگو کی جاتی تھی جس سے وہ بہت چڑ جاتا تھا۔ پھر اس صنفی عضو کا نام اس بچے کا تکیہ کلام بن گیا۔ جنس کی طرف اس قدر غیر معمولی توجہ نے اُسے اس معاملے میں پیش قدمی کے لیے اس حد تک اکسایا کہ قورخوانی میں اُس سے جنس کے سلسلے میں غیر ذمہ دارانہ افعال سرزد ہوئے۔ پھر وہ مرحلہ آیا کہ اُسے اپنی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ایک لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ یہ افسوس ناک انجام حالاں کہ انتہائی مثال ہے لیکن بے عبرت انگیز۔ عام طور سے بچوں کے ساتھ ایسا ہی مذاق کیا جاتا ہے جو اُن کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے، گویا ایسے لوگ جلتے بُو جھتتے اس کے دماغ کو ہر وقت اس کی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

بعض گھرانوں میں اس معاملے میں بھی احتیاط بُرتی جاتی ہے مگر وہاں ایک اور کمزوری ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ وہاں دیور، بھابھوں میں بچوں کی موجودگی میں ایسے ایسے مذاق ہوتے ہیں کہ تو بہ بھلی۔ ان لوگوں سے اگر کہا جاتا ہے کہ دیکھیے آپ کی ان حرکتوں کا بچوں پر بُرا اثر پڑے گا تو وہ صاف جواب دیں گے کہ آپ نے بھی خوب کہا۔ بھلا بچے ان باتوں کو کیا سمجھیں گے۔ ہاں مگر دیکھیے کہیں آپ بھی تو ایسا نہیں سمجھتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔! کیوں کہ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بچہ اپنی زبان اور اپنی عادتیں آپ ہی لوگوں سے سیکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس وقت بھی نہ چو کے گا۔

بچوں کو آوارہ بنانے کے لئے آج کل بہت سے ذریعے یا وسیلے موجود ہیں اور ان میں سب سے زیادہ فلمی گانے، ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ ہیں۔ پھر گندے رسالے اور تصویریں ان میں اور بھی اضافہ کر رہی ہیں۔ آج کل سینما کے پردوں، ٹی وی اور پوسٹروں وغیرہ کے ذریعے جو اشتہارات پیش کئے جاتے ہیں وہ عریانی، فحاشی اور مار دھاڑ کی بڑی خراب مثالیں پیش کرتے ہیں۔ میں نے بول چال سیکھنے کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ بچہ اپنی چھوٹی سی ہی عمر میں پہلے ان چیزوں کے معنی و مطلب جاننے کی کوشش کرتا ہے جن کو وہ بولنا شروع کرتا ہے۔ پھر آپ ہی کیسے یہ فلمی گانے وغیرہ جن کی وہ ہر وقت رٹ لگاتا رہتا ہے، کیا ان کے معنی مطلب جاننے کی کوشش نہ کرے گا؟ جس شخص کو بھی فلموں، فلمی گانوں، تصویروں اور بازاری رسالوں کا بہت شوق رہا ہوگا اس نے خود اپنے آپ پر اس بات کا تجربہ کیا ہوگا، اور اس بنا پر وہ یقیناً یہ کہہ سکے گا کہ اس کی جنسی زندگی میں ہیجان پیدا کرنے کے لئے یہ کچھ کم نہ تھے، اور ان کی وجہ سے اس نے جو کچھ خمیازہ بھگتا ہے وہ کچھ کم عبرت ناک نہیں ہے۔ اس بنا پر میں اپنے اندر یہ تڑپ رکھتا ہوں کہ کم از کم تمام صالح ماؤں کے بچے اس مغربی فتنے سے بچ جائیں جو فیشن تو ضرور ہے مگر ایسا جیسے کوئی بے شرم کھسیا کر منہ چڑانے لگے۔

ایک بار میں پھر عرض کروں کہ جنسی تربیت کی طرف سے بے پروائی آپ کے بچے کو فحاشی اور تباہ کاری کے گڑھے میں گرا دیتی ہے۔ اس لئے آپ اپنے گھر کو ایسی خامیوں سے پاک کیجیے، جو بچے کی جنسی زندگی کو خراب کر دے۔

خود اس دن سے خوف کھائیے جب اُسے بے راہ روی کے بدلے میں سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا گناہ نہیں۔ یہ تو دین و دنیا دونوں تباہ کر دیتا ہے۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک بات اور عرض کر دوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ دیکھیے اس پورے بیان میں میں نے کہیں بھی اس بات پر زور نہیں دیا ہے کہ ایسے مسائل کو آپ اپنی طرف سے چھیڑ دیں، بلکہ آپ تو صرف اُس وقت اس گتھی کو سلجھائیں جب

آپ دیکھیں کہ اب آپ کی مدد کے بغیر کام نہ چلے گا۔ ورنہ بے وقت ایسے تذکرے لے کر بیٹھ جانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ زبردستی اس کو اس طرف توجہ دلائیں گی۔

## معاشرتی نشوونما

دن میں جب سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی آپ اپنے کمرے اور کوٹھری میں بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ آخر یہ کیسے ہوتا ہے؟ بہت ہی آسان سی بات ہے۔ سورج کی کرنیں دیواروں اور زمین پر پڑتی ہیں، ان سے روشنی کا عکس دوسری دیواروں اور چیزوں پر پڑتا ہے۔ پھر وہاں دوبارہ عکس پیدا ہوتا ہے اور اس طرح کرنوں سے کرنیں پیدا ہوتی ہیں اور سب کچھ منور ہو جاتا ہے۔ آپ اس عکس کو بظاہر محسوس نہیں کر سکتیں۔ دیواروں میں شیشے کی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی، مگر یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے روشنی پھیلتی رہتی ہے۔ آپ یقین مانیں خود آپ کے جسم سے، آپ کے کپڑوں سے بھی روشنی کا عکس پیدا ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو خود یہ تجربہ کر لیں۔ اندھیرے کمرے کے دروازے پر سفید پوشاک پہن کر کھڑی ہو جائیے۔ دیکھیے اندھیرے میں ہلکی سی روشنی پیدا ہو جائے گی۔ بالکل اسی طرح ہماری عام زندگی میں ہمارے رہن سہن، عادات و اطوار اور میل جول کا عکس ایک دوسرے پر پڑتا رہتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی زندگی کے طور طریقے بے ارادہ اختیار کرتے رہتے ہیں اور ہماری اپنی گھریلو زندگی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے مگر ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جو تقسیم ملک کی وجہ سے ترک وطن پر مجبور ہوئے ہیں، ان کو اور جس جگہ وہ پہنچے ہیں وہاں کے لوگوں کو اس کا صحیح تجربہ ہو گا۔ آج کتنی ہی باتوں پر وہ بیٹھ کر سوچتے ہیں تو اچھیے میں بتلا ہو جاتے ہیں کہ ہائے یہ تو ہمارے یہاں کبھی نہ ہوا تھا، مگر اب پوشاک میں، کھانے پینے میں، یہاں تک کہ ملنے جلنے میں اور بات چیت میں بھی ایک دوسرے کے اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

جب ہمارا حال یہ ہے تو بچوں کے بارے میں اندازہ کیجیے۔ جن کو ہمارے درمیان زندہ رہنا ہے اور زندگی کے لئے ایسے طریقوں کو اختیار کرنا ہے جو انھیں دوسروں کے لئے

قابل قبول یا پسندیدہ بنا سکیں، انھیں اپنے ماحول میں مرتبہ حاصل ہو سکے اور اپنا مقام پیدا کر سکیں۔

انسان کی تو خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اور جب دوسروں کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو اُن کے دلوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنا ہوگی، کچھ اپنے لئے پابندیاں اختیار کرنی ہوں گی کچھ اپنی صلاحیتوں کو اظہار کا موقع دینا ہوگا۔ اپنے ماحول میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے پسندیدہ افعال پر عمل کیا جائے، ورنہ آپ جانتی ہیں، جہاں آپ نے معاشرے کے ان تقاضوں سے بغاوت کی آپ کے لئے پُر امن زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گی۔

لیکن یہاں ایک سوال یہ بھی تو پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضروری ہے کہ معاشرے کے پسندیدہ افعال واقعی پسندیدہ ہی ہوں۔ مثلاً مغرب کی عورت مجبور ہے کہ دعوتوں اور ضیافتوں میں وہ غیر مرد کے پہلو میں بیٹھے۔ مغرب کی عورت اگر رقص میں حصہ نہیں لیتی تو وہ غیر مہذب ہے، مگر یہ یقینی بات ہے کہ یہ تہذیبی اصول پست جذبات کی پھپھوری تسکین کے سوا کچھ اور نہیں پھر کیسے معاشرے کے پسندیدہ اور انسانی فلاح و بہبود کے اصولوں کا انتخاب کیا جائے؟ نہیں صاف کیوں نہ عرض کر دوں کہ انسان اپنی عقل و فہم سے اس کا فیصلہ کرنے سے معذور ہے۔ وہ اپنے جذبات سے، اُن کی لذت سے، اور ان کی کشش سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا، اور جب ایسا ہے تو لازماً وہ اکثر مواقع پر اپنی لذت پرستی کے لئے اپنے اصول اور طریقے بھی قربان کر دے گا۔ اس عرض کے لئے تو ایسی ہستی کا سہارا لینا ہوگا جو اگر ایک طرف انسانی جذبات کی کمزوریوں سے پاک ہو تو دوسری طرف انسانیت کی بھلائی بھی اسے عزیز ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسی ہستی کون ہے۔؟ ظاہر ہے کہ ہمارے خالق، مالک اور پروردگار کے سوا اور کون ہو سکتا ہے! وہ ہمارا پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے محبت کرے گا، وہ ہمارا مالک ہے، اس لئے اپنی ملک کو ضائع نہ ہونے دے گا۔ وہ ہمارا پروردگار ہے۔ اس لئے ہماری پرکٹھن و پرداخت میں ہماری بھلائی ہی کو مد نظر رکھے گا۔ ایسی صورت میں معاشرے کے لئے وہی قوانین اور وہی اصول پسندیدہ ہوں گے۔

جو اس کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ ہمیں سب کچھ اسی کے اصولوں پر جانچنا ہوگا اور جو کچھ اس کسوٹی پر پورا اترے گا وہی قابل قبول ہوگا۔ باقی رہے انسان کے بنائے ہوئے معاشرتی اصول، تو بہت ممکن ہے کہ وہ اچھے بھی ہوں اور بُرے بھی۔ اس لئے ان کی پابندی اور احترام ہم پر فرض نہیں۔

بہر حال ایک متوازن معاشرتی زندگی گزارے بغیر کوئی چارہ نہیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ بچہ اپنی ابتدائی زندگی میں ہی معاشرت کے بہترین اصولوں سے نہ صرف آگاہ ہوتا رہے بلکہ ان کو عملاً اپنے سامنے بتواتر بھی دیکھتا رہے۔ یہ چیز تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگی کہ ایسی بات جس پر ہم بغیر یقین کئے ہوئے عمل کرنے پر مجبور ہوں۔ ہماری زندگی کے معمول میں شامل نہیں ہونے پاتی۔ اکثر بچے آپ کی ہدایت اور تہنیدوں کے باوجود آپ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے لئے کیوں تیار نہیں ہوتے؟ کیوں اچھے بچے نہیں بنتے؟ صرف اتنی سی بات ہے کہ ان کے معصوم ذہن بڑی بڑی باتوں کی دُور رس خوبیوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ اسی وجہ سے ان کی سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی اور وہ آپ کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف اگر اچھے اصولوں پر عمل ان کی نظر کے سامنے مسلسل آتا رہے تو وہ ان کے عادی ہو جاتے ہیں اور انھیں اپنی زندگی کا معمول سمجھنے لگتے ہیں۔ بہت معمولی سی مثال ہے کہ کم عمری ہی میں جو بچہ روزانہ شام کو کھیل میں حصہ لیتا رہتا ہے وہ ایک عادی کھلاڑی بن جاتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی میں مستقلاً کھیل میں حصہ بھی لیتا رہتا ہے اور دل چسپی بھی محسوس کرتا ہے۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھیے اور پھر غور کیجیے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گی کہ آپ جس معیار کی معاشرتی زندگی گزاریں گی، بچے کی معاشرتی زندگی کا معیار بھی وہی بن جائے گا۔ پست گھرانے کے بچے اپنے طور طریقوں میں کیوں پست ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ انھیں اپنی زندگی میں بہتر اصولوں اور طور طریقوں کا تجربہ نہیں ہو پاتا۔ اب رہ گیا سوال بعد میں بہتر اصولوں اور طور طریقوں کے اختیار کرنے کا تو اس کو دوہری رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلی رکاوٹ تو یہ ہے کہ زندگی میں کسی تلخ تجربے کے بغیر وہ اپنے موجودہ طریقے کو بدلنے کے لئے تیار نہ ہوگا، بلکہ اس کی انتہائی کوشش تو یہی ہوگی کہ وہ اپنے موجودہ طریقوں کو ہی اس طرح کام

میں لائے کہ اس کا کام چل جائے۔ مثلاً ایک چور جب چوری کے جرم میں پکڑا جاتا ہے تو اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ کسی طرح خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، یا ایسے داؤوں استعمال کرتا ہے کہ صاف پتہ چل جائے۔ جی ہاں! اپنی خامیوں کے معاملے میں ہم سب کا یہی حال ہے۔ اپنی اصلاح کی طرف ہم بہت بعد میں متوجہ ہوتے ہیں، پہلے اپنی بچت کے لئے دلیلیں ہی تلاش کرتے رہتے ہیں۔

دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ بہتر اصولوں اور طریقوں کے اختیار کرنے میں اُسے رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ وہ خود اپنے طور پر فیصلہ نہیں کر سکتا کہ جس انداز کی زندگی وہ بسر کر رہا ہے اس میں کیا خامی ہے اور جو کچھ اصلاحیں لے کرنی چاہئیں وہ کیا ہوں گی؟ پھر یہ کہ وہ اپنا رہنمائی تلاش کرے تو کہاں کرے اور کیسے کرے؟ ایسی تحریک اور تلاش جو عوام انسان کے ضمیر میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اسے تو کچھ دور ساتھ لے چلنا پڑتا ہے اور نہ ہر الجھن اور ہر وقت پر وہ ہمت ہار دیتا ہے اور اپنے عزم و ارادے سے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

یہ باتیں اگر آپ کی نظر میں صحیح ہیں تو پھر یہ شکایت نہ کیجیے کہ آپ کا بچہ دوسروں سے بے تکلفی کے ساتھ ملنے مچلنے اور پیاری پیاری باتیں کرنے میں بھجک محسوس کرتا ہے۔ آپ کا اپنا رویہ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر بچہ کیسے سیکھ لے؟ اور یہ بھی کہ جب آپ اس کو ہمت نہیں دلاتے اور شاباشی نہیں دیتے تو وہ اس طرف متوجہ بھی کیسے ہو؟ اس کے اندر خود تو یہ فیصلہ کرنے کی قوت نہیں ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہی عمل سب سے زیادہ عمدہ ہے۔ اس کا احساس تو اسے صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کے اچھے افعال کو آپ اس کے دوسرے کاموں سے شاباشی دے کر اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے ممتاز کر دیں۔ تب ہی وہ سمجھ سکے گا کہ یہ وہ عمل ہے جس سے میں دوسروں کی نگاہ میں عزت اور دیوں میں محبت پیدا کر سکتا ہوں۔ وہ اس خوشنودی ہی کو اپنے لئے بہت بڑا انعام تصور کرے گا، اور آئندہ اس انعام کو حاصل کرنے ہی کے لئے وہ بار بار اچھے عمل کرتا رہے گا، یعنی انھیں دہراتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ اس کی زندگی کا جزو بن جائیں گے۔ میرے سامنے ایسے کتنے ہی بچوں کی مثالیں ہیں جو اپنے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے کے بعد آئندہ بھی اس امتیاز کے لئے کوشش

کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ دوسروں کے تعریفی کلمات سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ بھی اور کتنی ہی مثالیں ہیں جو ہمیں عام زندگی میں ملتی رہتی ہیں۔ کیا آپ ایسی مثالوں کو سامنے رکھ کر بچے کو معاشرتی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے میں مدد نہیں دے سکتیں؟

یہ انعام جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، صرف یہیں تک محدود نہیں ہے کہ اس کے ذریعے اُسے معاشرے میں اطمینان کی سانس لینے اور دوسروں کے عتاب سے بچنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ آپ نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ جب آپ کے کسی عمل یا فعل کو سراہا جاتا ہے تو آپ کو اندرونی سکون محسوس ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر آپ لوگوں کی تنقید کا نشانہ بن جائیں تو آپ کی طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ ایک طرح کی اُٹھن میں گرفتار ہو جاتی ہیں اور جب یہ رویہ ہمیشہ ہی رُوارکھا جائے تو آپ میں دوسروں کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ پھر آپ ان سے انتقام لینے کی خاطر غلط روش پر اُڑ جائیں گی۔ بچے کی کیفیت بھی بالکل یہی ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ آپ سرد و گرم آزما چکنے کی وجہ سے اکثر مصلحت اندیشی سے کام لیتی ہیں اور وہ ایسی کسی چیز سے آگاہ نہیں ہوتا۔

غرض اپنی روزمرہ زندگی کے خام تجربات میں سے پسندیدہ اصولوں کو اخذ کرنے کے لئے آپ کی رہنمائی کی اُسے شدید ضرورت ہے، اور خود آپ کی تمنا بھی تو یہی ہے کہ تہذیب و اخلاق کے لحاظ سے وہ آپ کی مسرتوں کا سبب بنے! اگر ایسا ہے تو آپ کو اپنی معاشرتی زندگی پر ایک بار نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ آپ دوسروں سے کس طرح پیش آتی ہیں؟ آپ کے بات کرنے کا لہجہ کیا ہوتا ہے؟ آپ بات کرتے کرتے جھنجھلا تو نہیں جاتیں؟ آپ کی آواز اونچی تو نہیں ہو جاتی؟ آپ ہر ایک کو شک کی نظروں سے تو نہیں دیکھتیں؟ ہر ایک آپ کی نگاہ میں ناقابل اعتبار تو نہیں؟ یہ بات تو آپ کے عام اخلاق کی ہوتی، مگر زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی آپ کو اپنا جائزہ لینا ہوگا، کیوں کہ آپ کی سلیقہ مندی، صفائی ستھرائی، وقت کی پابندی، صبر و تحمل، آمدنی اور خرچ میں تال میل، غرض کتنی ہی چیزیں ہیں جن سے بچہ بے جانے بوجھے متاثر ہوتا ہے اور انہی کو اپنا طریقہ بنا لیتا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ساری چیزیں موروثی ہیں، یہ تو اُس کے خون میں شامل ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ آنکھ کھولتے ہی

بچے نے جو طریقہ زندگی دیکھا ہے، وہ اسے صحیح سمجھ کر قبول کرتا جاتا ہے اور ویسے ہی ڈھنگ سیکھتا جاتا ہے جیسے اُس کو اپنے بڑوں کے نظر آتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کا یہ ایک اچھا طریقہ تھا کہ وہ بچوں کو مجلسی آداب سکھانے کی طرف خاص توجہ دیتے تھے، اُٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا خاص سلیقہ سکھایا کرتے تھے جس کے عام طور سے بڑے اچھے نتیجے برآمد ہوا کرتے تھے مگر مجلسی آداب سکھانے میں اگر صرف احکام سے کام لیا جائے، بچے کی مرضی کا خیال نہ رکھا جائے، یا بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس پر کوئی پمپنڈ اوپر سے لادی جا رہی ہے تو وہ آپ کی ہدایتوں کو اوپری دل سے قبول کرتا رہے گا، اور جب بھی اُسے آزادی نصیب ہوگی بغاوت کر دے گا۔ اس خطرے کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اسے جن اصولوں پر عمل کرنا ہے ان کی اس کے دل میں قدر بھی پیدا ہو سکے۔ مثلاً اس کے ساتھ کھینچنے والے بچے اخلاقی اور ذہنی طور پر پست نہ ہوں، گالی گلوچ اور دوسری بُری عادتوں میں مبتلا نہ ہوں، جن بڑوں کے گھروں میں اس کا روزمرہ کا جانا ہو وہ خوش اخلاق ہوں، عام اخلاقی برائیوں میں مبتلا نہ ہوں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے گھروں میں اُبٹ سڑی اور رنجشیں نہ ہوں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے فساد نہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہوں، اور آخر میں میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بچے سے متعلق افراد کا سوچنے کا ڈھنگ بھی بچے کی معاشرتی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ ہر چھوٹی سی مصیبت پر گھبرا اُٹھنے والے والدین اپنے بچوں کو اس کمزوری سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح دوسروں کی صرف خامیاں بیان کرنے والوں کی اولاد کنبہ پروری سے نہیں بچ سکتی۔ آپ میں جس قدر وسعت نظر ہوگی اور جس قدر اچھے انداز سے آپ اپنے حالات کا سامنا کرتی رہیں گی، آپ کے بچوں کی زندگی پر بھی اسی قدر اچھا اثر پڑے گا۔

بہر حال ایک بار پھر میں کہہ دوں کہ بچے کی معاشرتی نشوونما کے لئے مناسب حال معاشرتی ماحول کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اس کو اپنی زندگی کا سلیقہ سیکھنے کے لئے علمی نمونے نہ مل سکیں گے، اور وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔



## چند لفظوں میں

○ بچے کی تربیت کے لئے اس کی صلاحیتوں سے واقفیت ضروری ہے۔

### جذباتی نشوونما

○ آپ کی غیر متوازن تربیت بچے کے جذبات کو زیادہ بآگم بھرنے کا موقع دیتی ہے۔

○ جذبات کی شدت کے عالم میں بچے کو ہدایات دینے سے پرہیز کریں۔

### حسی نشوونما

○ بچوں کو اپنے احساسات پر بھروسہ کرنا سکھائیے۔ ان کے احساسات میں بے جا خیال نہ دیکھیے۔ ان پر اپنی پسند نہ ٹھونسیے۔

○ ابتدائی ناقص احساسات کی تربیت ضروری ہے، تاکہ جذبات ناقص نہ رہنے پائیں۔

### بول چال کی نشوونما

○ خیال رکھیے بچے کی بے معنی آوازیں بھی معنی رکھتی ہیں۔

○ بچہ خواہ غلط ہی لفظ بولے لیکن آپ صحیح الفاظ بولیں، تاکہ اس کے کان صحیح الفاظ سے آشنا رہیں۔

○ بول چال میں وسعت کے لئے اسے چیزیں دکھائیے اور نام بتائیے تاکہ وہ یاد رکھنے کی کوشش کرے۔

○ تو تلی زبان، فحش الفاظ اور گالیاں اس کے سامنے زبان پر نہ لائیے۔ ورنہ سیکھنے کے شوق میں وہ انھیں بھی سیکھ لے گا۔

○ اس کے برخلاف ایسے نام سکھائیے اور چیزوں کی شناخت کرائیے جو اس کی

اخلاقی اصلاح کے لئے مفید اور مددگار ہوں۔  
○ اس کی باتوں میں دل چسپی لیجیے۔ وہ بہت جلد بولنا سیکھ لے گا۔

### جنسی نشوونما

○ جنسی زندگی کے بارے میں مصنوعی یا ضرورت سے زیادہ شرم سے بچنے کے ذہن میں الجھاؤ نہ پیدا کیجیے۔

○ جنس کے معاملے میں سوال کرتے وقت بچے کو جھڑکیے نہیں، اور نہ وہ اُسے جرم سمجھ بیٹھے گا، یا ایسا راز جو اُس سے چھپایا جا رہا ہے۔

○ جب اس کا ذہن جنسی معاملات کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہو تو اُسے دوسرے کاموں میں مشغول رکھیے تاکہ اُس کی توانائی استعمال ہوتی رہے۔

○ آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ دیور بھاؤ جوں کے مذاق بچوں کے ذہن سے بالاتر ہوتے ہیں۔ احتیاط کیجیے۔

○ فحش گانے اور عُریاں ناچ بچے میں جنسی شعور کو وقت سے پہلے بیدار کر دیتے ہیں۔ جنسی دائیوں کو بھڑکانے والی فلمیں، رسالے، کتابیں جب بچے آپ کے ہاتھ میں دیکھے گا تو وہ انھیں اپنے لئے نمونہ بنا لے گا۔

○ جب تک بچہ جنس کے بارے میں سوال نہ کرے ان مسائل کو اپنی طرف سے ہرگز نہ پھیرئیے۔

### معاشرتی نشوونما

○ بچے کے لئے اپنی ابتدائی زندگی میں بہترین معاشرتی اصولوں کا تجربہ کرنا ضروری ہے

○ زندگی کے بہترین اصولوں پر عمل اگر بچے کی نظر کے سامنے مسلسل آتا رہے تو وہ اس کا مادی ہو جائے گا، اور اسے اپنی زندگی کا جزو بنا لے گا۔

○ بچہ جس معیار کی معاشرتی زندگی گزارے گا وہی اس کی زندگی کا معاشرتی معیار

بن جائے گا۔

○ پُست خیال و عمل کے گھرانوں میں اچھا معاشرتی معیار اختیار کرنے میں بچے کو دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

۱۔ جب تک اپنی عام زندگی میں سے کوئی تلخ تجربہ نہ ہو زندگی کا ڈھترہ بدلنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

۲۔ طرز زندگی بدلنے کے لئے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا انتخاب عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔

○ اچھی عادات اختیار کرنے پر بچے کو شاباشی ضرور دیجیے۔ اس سے اس کی ہمت بڑھے گی اور وہ آئندہ عمل کرنے پر بھی آمادہ ہوگا۔

○ اچھی عادات سکھانے سے نہیں بلکہ خود ان پر عمل کر کے دکھانے سے سکھائی جاتی ہیں۔ یہی آپ کا طریقہ ہونا چاہیے۔

○ بچے کے لئے ایسا ماحول پیدا کیجیے کہ بچہ اچھے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے پابندی نہیں، آزادی محسوس کر سکے۔

○ بچے کی مدد کرتے وقت اُسے اُس کی ناکامی کا احساس نہ دلائیں۔

○ ذہنی استعداد بڑھانے کے لئے پہیلیاں، رشتے اور تعلقات کی تفصیل اور ملکوں کے حالات وغیرہ سنائیے۔

○ بچے سے یہ بھی نہ کہیے کہ وہ کم عقل ہے۔ اس سے اُس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔

○ بچے سے جو کام آپ لینا چاہتی ہیں پہلے اس میں اس کی دل چسپی پیدا کریں، خواہ تعلیم ہی کیوں نہ ہو۔

○ بچے کی ذہنی مشغولیت میں اس کی عمر کا لحاظ ضرور رکھیے۔

○ بچہ جب اوٹ پٹانگ سوچے تو دانش مندی کے ساتھ اس کی رہنمائی کیجیے، تاکہ وہ سوچنے کا انداز بھی سیکھ جائے۔

## بچے کی نئی نئی مشکلات

بچے کی تربیت کے سلسلے میں بنیادی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے یہ بات اچھی طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بچے جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے اس کے سیدھے سادے مسائل میں چھوٹی موٹی مشکلیں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر ان مشکلوں کا سامنا کرنے کے لئے وہ ذاتی طور پر خود کوئی حل سوچ لیتا ہے اور اس کو عمل میں لاتا ہے، لیکن جب یہ حل آپ کے علم میں آتا ہے اور آپ کے لئے پسندیدہ نہیں ہوتا تو آپ بڑی الجھن میں پھنس جاتی ہیں۔ مثلاً اس سے پہلے بچے کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ گود میں گھس رہے لیکن نہ جانے اس کو ان دنوں کیا ہو گیا ہے کہ آپ جب بھی اس کو بستر پر لٹاتی ہیں وہ چیخا شروع کر دیتا ہے اور پھر جیسے ہی گود میں لیتی ہیں چُپ ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس کی یہ عادت بالکل پسند نہیں آتی، کیوں کہ آپ کہاں تک اس کو گود میں لئے رہیں گی؟ آپ کو بیسیوں اور کام ہیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ آپ اپنا بیچھا چھڑانے کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جسے بچہ اپنے لئے ناشائستہ سمجھے، جیسے مار پیٹ وغیرہ! بہر حال نہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ بچے کی اس ناجائز خوشی کے لئے اپنا نقصان کریں اور نہ یہ کہ ایک ذرا سی کوتاہی کی وجہ سے اس میں چند ایک خرابیاں پیدا کر دیں۔ بس اب اگر کوئی چارہ ہے تو یہ کہ آپ اس کی اصلاح کے لئے مناسب طریقے اختیار کریں۔

بچے کو جب ایسی مشکلات پیش آنا شروع ہو جائیں تو آپ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ وہ اس مشکل کا مقابلہ کس طرح کرتا ہے اور اگر یہ مقابلہ وہ غلط طریقے سے کر رہا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ کیوں صرف اسی طریقے کو اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے؟ کیوں اس نے

ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جو آپ کے لئے اتنا پریشان کن نہ ہوتا ہے اور کیا ایسا تو نہیں کہ اس مزید الجھن کے پیدا ہو جانے کی وجہ آپ ہیں؟ ان تمام چیزوں پر غور کیجیے اور پھر اس کو ان مشکلات سے بچانے کی کوشش کیجیے۔

ایسی مشکلات تقریباً اس عمر میں پیش آتی ہیں جب بچے کچھ سوچنا شروع کر دیتا ہے اور آپ جانتی ہیں کہ جب کوئی سوچنا شروع کر دیتا ہے تو بیسیوں طرح کی باتیں اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بچے کے ذہن میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری عمل ہے۔ ان مشکلات سے گھبرانا اچھا نہیں۔ کیوں کہ ان کو بہر حال پیش آتا ہے اس لئے آپ ان کی طرف صبر اور استقامت سے توجہ دیں۔

اگر آپ گننا شروع کر دیں تو شاید آپ نئی نئی پیدا ہونے والی مشکلات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کر لیں۔ اب اگر ہر ایک کا تذکرہ کیا جائے اور ان سب کے حل پیش کئے جائیں تو شاید آپ کا بیشتر وقت اسی کی نذر ہو جائے گا۔ اس لئے یہاں صرف انہیں دوچہار مشکلات کا تذکرہ کرنا اور حل بیان کرنا مناسب ہو گا جو بڑی اہم ہیں اور جن سے آپ کا سابقہ بڑنا لازمی ہے۔

## دوسرے بچے آنا

بچے اور ماں کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بچہ ماں کی محبت کا بے حد خواہش مند رہتا ہے اور یہ بات تو بتانے کی ضرورت بھی نہیں، ہر ماں کو اس کا تجربہ ہوتا ہی ہے۔ ہر ماں اچھی طرح جانتی ہے کہ بچہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے دل میں بچے کے لئے جو محبت اور خلوص ہے وہ دوسروں کے دلوں میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ایسی حرکتیں جو دوسروں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں وہ ماں کے لئے بڑی اہم ہوتی ہیں اور وہ ان سے بچے کی بہت سی خواہشوں کو سمجھ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ان تمام مطالبات کو پورا کرتی ہے۔ ماں کی یہ شفقت اور محبت بچے کے لئے بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ وہ اس تعلق کی بنا پر ہی ماں کو بے انتہا چاہنے لگتا ہے، اور اس سے الگ رہنے کے

لئے بالکل تیار نہیں ہوتا۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کو دودھ پینے سے اتنی ہی غرض ہے کہ اس کی بھوک کی تسکین ہو جاتی ہے اور اگر اس کی یہ طلب کسی اور طرح پوری ہو جاتی تو وہ اس کی طرف توجہ نہ دیتا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ بچہ صرف دودھ ہی نہیں پیتا بلکہ وہ ماں کی گود میں جا کر بڑا سکون بھی محسوس کرتا ہے۔ خیال کیجیے ماں کی نرم نرم گود اس کے لئے کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس کو ہلکے ہلکے ہچکولے بھی نصیب ہوتے ہیں، اور وہ لوریوں کا سا لطف حاصل کرنے لگتا ہے، ماں اپنی فطری حیا کی وجہ سے جب بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اس کو اپنے پلو سے ڈھک لیتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ایسی تنہائی میسر آ جاتی ہے جس میں وہ بے انتہا عافیت محسوس کرتا ہے، اور یہ عافیت محسوس کر کے ہی وہ اکثر سو بھی جاتا ہے۔ آپ یہ بھی محسوس کریں گی کہ آپ کا بچہ آپ کا دودھ پیتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے لئے آپ کے اندر محبت اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ آپ اس کو تھپکنا بھی شروع کر دیتی ہیں۔

اب بھلا سوچیے کہ اگر اس کی بھوک کسی اور طرح سٹ جاتی تو وہ یہ تمام رعایتیں آپ سے کیسے حاصل کر سکتا؟ اس کو آپ کی گود میں لیٹنا، اس میں عافیت محسوس کرنا، آپ کے تھپکنے اور لوریوں سے لطف اندوز ہونا اسے کہاں ملتا؟ اسی لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بچہ دودھ پیتے وقت محض بھوک مٹانے کی جگہ کسی اور ہی بات کا خواہشمند ہوتا ہے۔

فیصلہ کیجئے کہ ان تمام رعایتوں سے بچہ کیسے دست بردار ہو جانا پسند کرے گا؟ وہ تو بہی چاہے گا کہ اس کو جتنے دن یہ رعایتیں حاصل رہیں اچھا ہے۔ اب اگر آپ اس کو ان راحتوں سے محروم کرنا چاہیں گی تو وہ آپ کے لئے نئی نئی مشکلات پیدا کر دے گا۔ بعض مائیں انھیں مشکلات سے بچنے کے لئے بچے کو مقررہ مدت سے زیادہ عرصے تک دودھ پلاتی رہتی ہیں۔ یہ عمل بچے کی ذہنی کیفیت کے لئے مفید نہیں ہوتی۔ بچہ جب زیادہ عرصے تک دودھ پیتا رہتا ہے تو گویا اس کو ماں کی محبت اور عافیت بھی اتنے ہی زیادہ عرصے حاصل رہتی ہے۔ چنانچہ وہ ماں کی محافظت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے لگتا ہے، وہ تمام کاموں میں ماں کی امداد کا خواہش مند رہتا ہے۔ اپنے آپ کسی کام کو کر لینا اس پر بار گزرتا ہے، بس جو کچھ ہے وہ ماں

ہی کے ذریعے ہے۔ یہی نہیں کہ یہ انداز اس بچپن کی زندگی تک محدود رہے بلکہ آئندہ زندگی میں بھی وہ بڑا بے پروا اور غیر ذمے دار انسان ثابت ہوتا ہے، اسے اپنے دماغ اور عقل کو استعمال کرنا بے حد بارگزر ملتا ہے۔

کچھ ایسی مائیں بھی ہیں جو وقت سے پہلے بچے کا دودھ ٹھنڈا دیتی ہیں۔ ان کو کسی نہ کسی طرح یہ احساس ہو جاتا ہے کہ بچے کو زیادہ عرصے تک دودھ پلانا اچھا نہیں ہے، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ہوتی ہے کہ خانہ داری کے دوسرے جھمیلوں کی وجہ سے ان کے لئے اس فرض سے سبک دوش ہو جانا ضروری ہوتا ہے جس بچے کو اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس بچے کے بالکل برعکس ہوتا ہے جو زیادہ عرصے تک دودھ پیت رہتا ہے۔ ماں کی محبت اور شفقت جو دودھ پلاتے وقت اس کو میسر آتی ہے وہ اس سے محروم ہو چکا ہوتا ہے۔ ماں کی گود میں رہ کر جو محافظت وہ محسوس کرتا ہے وہ بھی اس سے چھین جاتی ہے۔ دودھ پیتے وقت تھپکا جانا اور لوریوں سے مٹھی مٹھی نیند محسوس کرنا بھی اس کو نصیب نہیں ہوتا۔ اب وہ ایسا سمجھنے لگتا ہے کہ جیسے اس کا کوئی محافظ نہیں ہے، اس سے کوئی محبت کرنے والا نہیں ہے، وہ کسی کے پاس داد و فریاد لے جانے کا حق نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ اپنی حفاظت کی ذمے داری خود ہی اٹھانے لگتا ہے، اور یہ حفاظت بھی وہ الگ تھلگ رہ کر، کوٹنے کھتروں میں چھپ کر کرتا ہے۔ وہ بچوں سے زیادہ بلنا یا بات کرنا پسند نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے ان سے زیادہ رسم و راہ پیدا کی تو میں کسی نہ کسی وقت پٹ بھی جاؤں گا۔ اب تو آپ نے اندازہ کر ہی لیا ہو گا کہ اس معاملے میں آپ کی احتیاط یا بد احتیاطی بچے کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہوتی، بلکہ جو مدت اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے، وہی سب سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو سال کا عرصہ دودھ پلانے کے لئے مقرر کیا ہے، اس عرصے کے اندر اگر آپ غور سے دیکھیں تو اندازہ کریں گی کہ بچہ اچھی طرح اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو ماں کے دودھ سے زیادہ دوسری کھانے پینے کی چیزوں کی طرف رغبت ہونے لگتی ہے لیکن بہت سی مائیں اس فطری حکم کو زبردستی بچے پر نافذ کرتی ہیں۔ جب وہ جان لیتی ہیں کہ اب بچے کا دودھ پینے کا شرعی زمانہ ختم ہو گیا تو وہ اپنی چھاتیوں

پر ایسی کڑوی کسلی چیزیں لگائیں ہیں کہ بچہ جیسے ہی مُنہ لگاتا ہے اس کا مُنہ خراب ہو جاتا ہے، اور وہ رونے پینے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ دودھ نہیں لیتا لیکن پھر جب کسی غلط امید کے سہارے وہ ماں کے دودھ کی خواہش کرتا ہے تو اسی زہر کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر اس کو صدمہ ہوتا ہے۔ غرض کہ وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اس میں تمام وہی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں جن سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک فطری زماہ مقرر کیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ بچہ اس عرصے کے بعد خود بخود دودھ طلب نہ کرتا لیکن عملی طور پر ہوتا یہی ہے کہ ہر بچہ مجبوراً کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کبھی آپ نے بھی سوچا؟

دیکھیے! — جب آپ بچے کا دودھ ٹھنڈا کرنا چاہتی ہیں تو پوری طرح اس سے بیزاری کا اعلان کر دیتی ہیں۔ جی ہاں! میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ اعلان بیزاری نہیں تو کیا ہے کہ آپ اس کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتیں کہ کہیں وہ آپ کو دیکھ کر دودھ طلب نہ کرنے لگے۔ یہ بھی تو بہر حال آپ کی زیادتی ہے کہ آپ دودھ پر کڑوی کسلی چیز لگا دیتی ہیں۔ پھر اگر اس کے بعد بھی وہ باز نہیں آتا تو آپ اس کی پٹائی کرتی ہیں۔ دو چار چھ بار پٹنے کے بعد اور دو چار چھ بار ضد کرنے اور مایوس ہوجانے کے بعد وہ یقین کرنے لگتا ہے کہ یہ دل وہ نہیں ہے جس میں اُس کے لئے کسک تھی بس اس لئے وہ اپنی شکست مان لیتا ہے اور دودھ نہیں مانگتا۔ لیکن آپ سمجھتی ہیں کہ اُس نے دودھ پینا چھوڑ دیا۔ دودھ پینا تو وہ اسی وقت چھوڑ چکا تھا جب اس کے معدے نے تعیل غذائیں مہم کرنا شروع کر دی تھیں۔ اب وہ دودھ تھوڑی پی رہا تھا، وہ تو آپ کی محبت اور شفقت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ آپ کی چچائیوں سے چمٹا ہوا تھا، ورنہ جیسے آج اُسے زبردستی چھوڑنا پڑا ہے وہ اسی طرح بغیر کسی مجبوری کے بہت عرصہ پہلے چھوڑ چکا ہوتا۔

جن بچوں سے زبردستی دودھ چھڑایا جاتا ہے ان کے بارے میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کو صرف دودھ ہی سے نفرت نہیں ہو جاتی بلکہ دودھ سے بنی ہوئی ساری ہی چیزوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ آپ نے اُس کو نفرت دلا دیا کہ دودھ پینا چھڑا یا ہے۔ اب جب اُسے دودھ سے نفرت ہو گئی ہے تو دودھ سے بنی ہوئی دوسری چیزوں سے کیوں رغبت رکھائے؟



پسند اکثر آپ کے لئے پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور خاص کر اُس زمانے میں جب بیماری کی وجہ سے آپ اس کو اور کوئی غذا نہیں دے سکتیں اور وہ اپنی اس پیدائشہ نفرت کی وجہ سے انھیں استعمال نہیں کر سکتا۔ اس لیے دودھ چھڑاتے وقت ان باتوں کا تو آپ خاص طور سے خیال رکھیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب آپ بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں، اس پر کسی طرح یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ کی محبت میں کمی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ آپ ویسا ہی برتاؤ رکھیں جیسا کہ آپ اُس زمانے میں رکھتی تھیں جب وہ دودھ پیتا تھا۔ آپ اُس کے ساتھ اتنی ہی محبت کا اظہار کریں جتنی آپ کو دودھ پلاتے وقت اُس سے ہو جایا کرتی تھی۔ آپ اس کو اب بھی گود میں سو رہنے اور لوریاں سننے کا پورا پورا موقع دیں، تاکہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اب ایک نئی تبدیلی ہو رہی ہے، اور اس سے کوئی پسندیدہ چیز چھینی جا رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب وہ کھانا شروع کر دے اور چیزوں کو دانت سے کاٹنا شروع کر دے تو آپ اس کو رغبت دلا کر چیزوں کو چبانے کا موقع دیں۔ اس کو پھل وغیرہ جب کھانے کو دیں تو اس کے دانتوں کی تعریف اس طرح کریں کہ وہ اول تو یہ سمجھ سکے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اطمینان محسوس کرنے لگے کہ اس کے دانت کسی کام کے لائق ہیں اور وہ ان سے کوئی کام لے سکتا ہے۔ اس طرح وہ دودھ پینے کے بجائے کھانے میں دل چسپی لینے لگتا ہے۔ پھر دانتوں کا استعمال کرنا تو اس کے لئے فطری عمل ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی چیز مل رہی ہے، اور وہ اس پر تجربہ کر رہا ہے کہ وہ کس کام آسکتی ہے اور کس قدر مفید ہے؛ چنانچہ آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہو گا کہ جب آپ کے بچے کے دانت نکلنے شروع ہوئے تھے تو اس نے دو ایک بار دودھ پیتے ہوئے آپ کے کاٹ بھی لیا تھا، اور آپ نے تکلیف کی وجہ سے اس کو مار بھی دیا تھا۔ اور یہ آپ نے غلط کیا تھا۔

آپ کو اُسے مار دینے کے بجائے چاہیے یہ تھا کہ دودھ کو آہستہ سے اس کے منہ سے نکال لیتیں اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیتیں۔ لیکن یہ مار دینا تو آپ کی دودھ چھڑانے کی مہم میں ٹکاوٹ بن گیا۔ کیوں کہ وہ دانتوں کے استعمال کو بُرا کام سمجھنے لگا ہے۔ ایسا بُرا کام

کہ اس کے کرنے پر اس کی سہزنش ہو، مانیسیب ہو۔ چنانچہ وہ دانتوں کے استعمال کرنے کو خیرم اور اس کے بجائے دودھ سے چمٹے رہنے کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ بہر حال اگر آپ اسے دودھ سے خوراک کی طرف لانا چاہتی ہیں تو آپ کو ایسی احتیاطیں کرنی ہی پڑیں گی ورنہ دودھ چھڑانا آپ کے لئے ایسا ہی مشکل کام بن جائے گا جیسا آپ کے اردگرد کی دوسری عورتوں کے لیے ہے۔

## بستر خراب کرنا

ایک اور پریشانی جس کا آپ کو ہر حالت میں سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بچے کا بستر خراب کر دینا ہوتا ہے۔ بہت کم بچے ایسے ہوتے ہیں جو پلنگ پر پیشاب یا پاخانہ کر دیتے ہوں ورنہ اکثر کو اس کی عادت ہوتی ہے اور خاص طور سے پیشاب کر دینا تو ان کے لئے معمولی سی بات ہوتی ہے اور آپ کو جب دھونا پڑتا ہے تو کھل جاتا ہے۔ روز روز کی یہ ڈرگت آپ کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے اور آپ مجبور ہو کر بچے کو ٹوکنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے دھمکیاں دینے لگتی ہیں اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو پھر سزا دینا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن بچے کی یہ عادت آپ کی تمام روک ٹوک کے باوجود بڑھتی چلی جاتی ہے اور بالآخر آپ یہ فیصلہ کر لیتی ہیں کہ اس کو بستر پر پیشاب کرنے کی بیماری ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں ایسا ہی ہو مگر زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔ بچے کا بستر خراب کر دینا محض بیماری کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات دوسری ہی وجہیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ ان پر غور کریں اور اس اصل وجہ کا سدباب کرنے کی کوشش کریں تو اس کی یہ حرکت خود بخود جاتی رہے گی۔

جو بچے ہر وقت بستر ہی پر پڑے رہتے ہیں وہ تو بستر ہی پر پیشاب وغیرہ کریں گے لیکن اگر آپ اس چیز کو ان کے لئے مجبوری سمجھ کر ٹالتی رہیں گی تو بچہ ہمیشہ بستر پر ہی پیشاب کرے گا۔ وہ کیا سمجھے گا کہ ایسے موقع پر دوسروں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسا طریقہ اختیار کرنا لازمی ہوتا ہے کہ بستر خراب نہ ہو؟ — دیکھیے آپ یہاں یہ بات نہ پھیرتیے کہ آپ کے بچے کو جب حاجت محسوس ہوتی ہے تو وہ رونے لگتا ہے یا بے چین ہو جاتا ہے۔ یہ تو اس کے لئے

فطری ہے لیکن یقین کیجیے، نہ وہ بستر سے اٹھنے کے لئے بے چین ہوا ہے، نہ آپ کی مدد چاہنے کے لئے! البتہ اگر آپ ایسے وقت اس کی مدد کو پہنچ جائیں تو وہ معاملے کی نوعیت کو ضرور سمجھنے لگے گا اور رفتہ رفتہ اس کی ایسی عادت پڑ جائے گی کہ وہ آپ کی مدد کے بغیر اجابت نہ کرے گا۔ اس کا تجربہ ایک بچے پر کیا گیا ہے، اور میری نظر سے گزر چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس طرح وہ پیشاب کرنے کے لئے رات کے اندھیرے میں بھی پلنگ سے نیچے اترنا ہی پسند کرتا تھا اور شاید ہی کبھی بے خیالی میں اس نے بستر خراب کیا ہو۔ اس طرح یہ توجہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کی بنا پر اس کی آئندہ پڑ جانے والی خراب عادت کو آپ ہمیشہ کے لئے فن کر دیں گی۔

ایک اور وجہ پیشاب کر دینے کی یہ بھی ہے کہ اگر بچے کو سونے سے پہلے پیشاب نہ کرایا جائے تو وہ سوتے میں حاجت سے مجبور ہو کر بے خیالی میں ضرور بستر خراب کر دے گا۔ پھر اگر وہ اس طرح دو چار بار کرتا رہا تو یہ اس کا معمول ہو جائے گا۔ وہ اب اس وقت اکثر پیشاب کر دے گا جب کہ وہ سوتے میں ایسا کرتا تھا۔ اس عادت کو ٹھہرانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ سونے سے پہلے اس کو اس ضرورت سے فارغ کرایا جائے۔

اس سے بھی اہم وجہ بچے کا ڈر جانا ہے۔ بچے جب اندھیرے میں خوف یا ڈراؤنے خواب سے ڈرتا ہے تو بھی وہ بستر خراب کر دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس کے لئے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنا اور بچاؤ کی تدبیر سوچنا ممکن نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ وہ ڈر جائے اور اپنی شکست کا اعلان کر دے۔ یہ اعلان وہ جانتے بوجھتے نہیں کرتا، بلکہ اس کے انجان پن میں ہوتا ہے، اور وہ باوجود کوشش کے اپنے آپ کو بستر خراب کرنے سے باز نہیں رکھ پاتا۔ ایسے وقت آپ اس کو معذور سمجھیے، اور بجائے اسے ڈانٹنے یا سزا دینے کے اس کی پریشانی کو دور کیجیے، اور یہ بھی کہ جب وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھے اور بستر خراب کر دے تو ہمدردی کے ساتھ اسے گود میں اٹھالیجیے اور ذرا بھی یہ احساس نہ ہونے دیکھے کہ اس نے کوئی بڑی حرکت کی ہے۔ جی ہاں! اس نے یہ کوئی بڑی حرکت نہیں کی ہے۔ اگر اس نے ڈراؤنا خواب نہ دیکھا ہوتا تو پیشاب کیوں کر دیتا۔ البتہ یہ ضرور کیجیے کہ اس کی

توجہ پیشاب کی طرف سے ہٹا کر دلاسا دینے اور بہلانے کی طرف موڑیئے۔

یہ یاد رکھیے کہ جو بچے روزانہ سوتے ہیں ڈر جاتے ہیں ان کو بھی بستر خراب کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس عادت کا چھڑانا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے اُن کو خوف ہوا ہو اُسے اُن سے دور کیا جائے۔

ایک اور دل چسپ وجہ بستر خراب کرنے کی یہ بھی ہے کہ بچے آپ کی محبت یا توجہ حاصل کرنے کے لئے ایسا کر دیتا ہے۔ یہ بڑی ہی عجیب سی بات ہے، لیکن یہ حقیقت! بچے جب یہ دیکھتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی محبت یا توجہ میں کمی ہو رہی ہے تو وہ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے وہ دوبارہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، اور شاید اسی طرح آپ اس سے محبت کرنے لگ جائیں! یہ جذبہ خاص طور سے اُن بچوں میں پیدا ہوتا ہے جن کے اور بھائی بہن بھی ہوتے ہیں اور اس کی ماں کو ہر ایک کی طرف برابر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہوتا ہے کہ ہر بچے کو پورا پورا وقت دیا جائے، کسی نہ کسی وقت تو ان میں سے ایک کے بجائے باقی کو ماں کے بغیر ہی رہنا پڑے گا۔ لیکن ان میں سے وہ بچہ جو بستر خراب کر دیتا ہے وہ کسی لمحہ بھی اکیلے پڑے رہنا پسند نہیں کرتا۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی ماں ہر وقت اس کے پاس موجود رہے۔ (اس کا یہ چاہنا بھی اکثر ماں ہی کی کوتاہی کی وجہ سے ہوتا ہے) اس لئے وہ بستر خراب کر دیتا ہے کہ اب تو ماں اس کی طرف متوجہ ہوگی، اب تو وہ اسے اٹھائے گی، اُس کے کپڑے تبدیل کرائے گی اور بستر دھوئے گی۔ کچھ نہ سہی اتنی محبت اور اتنا تعلق تو نصیب ہو ہی جائے گا ایسے بچے کو ماں جتنی سزا دیتی ہے اتنا ہی بچہ اپنی اس حرکت پر جمتا چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ ایک طرف آپ کا غصہ ہونا اور دوسری طرف آپ کا متوجہ ہونا، یہ تو اس کے حصے میں آ ہی جاتا ہے، یہی کیا کم ہے۔

ایسے بچے کی عادت چھڑانا بڑا مشکل ہوتا ہے، اور خاص طور سے ان ماؤں کے لئے جو بچے کو مجرم سمجھنے لگتی ہیں وہ ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں اور بھول کر بھی کسی وقت محبت کا اظہار نہیں کرتیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ شاید بچہ اس کی خفگی کا خیال کر کے اپنی حرکت سے باز آ جائے گا۔ لیکن ایک طرف وہ ان عادتوں کو چھوڑتا نہیں، اور دوسری

طرف آپ کے اظہارِ نفرت کی وجہ سے اپنے اندر چند دوسری بیچیدگیاں پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح ان ماؤں کے لئے ایک اور مصیبت اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے نفرت اور خفگی کا برتاؤ کرنے کے بجائے محبت اور شفقت کا برتاؤ کریں۔ اس کے دل سے یہ وہم دور کریں کہ اس سے ماں کو نفرت ہو گئی ہے، اور اس نے اب اس سے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح جب اس کو یہ یقین ہو جاتا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہا تھا حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے تو وہ خود بخود اپنی عادت کو چھوڑ دیتا۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیے کہ آپ اس خراب عادت کو کبھی سزا دے کر نہیں چھڑا سکتیں، کیوں کہ سزا کی وجہ سے بچے کے دل میں خوف اور بھی زیادہ بیٹھتا چلا جائے گا، اور پھر اگر وہ خوف کی وجہ سے بستر خراب نہیں کر رہا تھا تو اب خوف کی بنا پر ایسا کرنا شروع کر دے گا۔ پھر یہ آپ کے لئے اور بھی زیادہ مشکل مسئلہ بن جائے گا۔

بستر خراب کر دینے والے بچوں کا بہترین علاج تو یہ ہے کہ آپ ان کو صاف ستھرا رہنے کی تلقین کریں اور خود ان کو یہ احساس دلائیں کہ اگر وہ اچھے بچوں کی طرح رہیں گے تو دوسرے بھی ان سے محبت کرنے لگیں گے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو گندے بچوں میں شمار کئے جائیں گے اور گندے بچوں کے بارے میں تم جانتے ہو کہ ان کو کوئی پسند نہیں کرتا۔

بہت سے گھروں میں دیکھا گیا ہے کہ سوتے میں پیشاب کر دینے والے بچے کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اُسے چڑایا جاتا ہے، اور اس کو شرمندہ کرنے کے لئے اُس کی ہنسی اڑانے کے لئے اُس کے ایسے نام رکھ لئے جاتے ہیں جن سے وہ اپنی بے عزتی ہوتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔ مثلاً اس کو ”مٹوڑا“ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس ہتک سے خود اُس کی اپنی نظر میں اُس کی قدر گھٹ جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک ذمہ ناکارہ ہو۔ بچے کو جہاں یہ احساس ہوا، بس وہ بے کار ہو گیا۔ اب وہ اپنی اصلاح نہ کر سکے گا۔ اگر وہ کوشش بھی کرے گا تب بھی نہ کر سکے گا، کیوں کہ اب تو اس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ وہ کسی کام کا نہیں ہے، کسی لائق نہیں ہے۔

اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے بچے میں یہ خرابی پیدا نہ ہو تو آپ کسی بھی صورت میں اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہاں اگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اس خرابی کو دور کر بھی لے گا جس کی وجہ سے وہ سب کے مذاق کا نشانہ بنا ہے تو یہ احساس تو بہر حال ختم نہ ہو گا کہ وہ بڑا ہے، اس کا مذاق اڑایا جاسکتا ہے۔ یہ تصور اس کے اندر ایک جھجک اور کمتری کا احساس پیدا کر دے گا جو اس کی ذہنی صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

## تو بلانا اور ہرکلاتا

ایک ماں کے لئے بچے کی یہ خامی خاص طور سے تکلیف دہ ہوتی ہے کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ ایسا بچہ جو تو تڑا ہوا یا ہکلا ہو کسی کام کا نہیں رہتا۔ لوگوں کے مذاق کا نشانہ تو وہ پہلے بن جاتا ہے اور بعد میں ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنا اظہار خیال بھی آزادی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جہاں بچے میں تو تڑاپن یا ہکلا پن محسوس کیا جانے لگتا ہے فوراً اس کے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر خدا نخواستہ یہ نقص دور نہیں ہوتا تو اس کو قسمت کا لکھا سمجھ کر گوارا کر لیا جاتا ہے۔ جن بچوں میں یہ عارضہ کی صورت میں لقوہ یا زبان کی ناقص بناوٹ کی وجہ سے پائے جاتے ہیں ان کے معاملے میں تو یقیناً مجبوری ہے لیکن ان بچوں کو جن میں یہ خرابیاں محض نقل کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں، فطری طور پر ناقص بچوں کی صف میں شمار کرنا دانش مندی نہیں ہے، اور اکثریت ایسے ہی بچوں کی ہوتی ہے جو فطری طور پر ناقص نہیں ہوتے بلکہ بنا دیئے جلتے ہیں۔ اس لئے ہمارے واسطے یہ بہت ضروری بات ہے کہ ہم اس کا پتہ لگائیں کہ ہمارے بچے میں یہ خرابی کیسے پیدا ہو گئی ہے؟

بڑھی عورتیں عام طور سے بچوں کو تولیے اور ہکٹے لوگوں کی نقل اتارنے سے منع کرتی ہیں۔ وہ تو اس قدر سختی سے ٹوکتی ہیں کہ بچے کو ایک بار بھی اس طرح کی نقل کرنے نہیں دیتیں، لیکن زیادہ تر بچے بڑے بوڑھوں کی بات کو رد کرنے میں بڑا لطف لیتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس سے انھیں منع کیا جاتا ہے۔ اگر آپ ایسے بچوں کی بولی پر غور کیجیے تو آپ دیکھیں گی کہ کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ان کی بول چال میں وہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے جس سے ان کو روکا جاتا ہے۔ صرف آٹھ

دس بار کی نقل ان کو بھی ویسا ہی تو تلا یا ہٹکلا بنا دیتی ہے۔ ایسے بہت سے بچے تجربے میں آئے ہیں جو محض نقل کرنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے تو تے یا ہٹکے ہو گئے ہیں اور جب ایک بار ان میں نقص پیدا ہو گیا تو باوجود کوشش کے وہ پوری طرح دور نہ ہو سکا۔ اس کا خاص طور سے لحاظ رکھیے کہ وہ نقل نہ کرنے پائیں۔ البتہ ان کو ٹوکنے اور منع کرنے کے بجائے اس نقص سے عبرت دلائیے اور ان میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناپسندیدگی سے خوف پیدا کرائیے اور ایسے کاموں کی ترغیب دلائیے جن کو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے وہ اختیار کریں۔ اس طرح وہ نقل کرنا خود ہی چھوڑ دیں گے اور بڑی نارت سے بچ جائیں گے۔

یہ تو وہ طریقہ تھا جس سے وہ خود ان نقائص کو اختیار کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ ذرائع ایسے ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں ہوتے بلکہ وہ محض ماں باپ کی خوشی حاصل کرنے کے لئے پیدا کر لیتے ہیں۔

پہلے میں تو تے پن کے بارے میں بیان کروں گا:

بچوں کے بول چال سیکھنے کے سلسلے میں بیان کر چکا ہوں کہ شروع میں بچہ پورے پورے لفظ ادا نہیں کر پاتا ہے۔ وہ ان کے لئے چھوٹے چھوٹے اشارے مقرر کر لیتا ہے اور انہی سے اپنا کام چلاتا ہے۔ مثلاً جب اس کو پانی پینا ہوگا تو وہ صرف "مم" کہہ کر اپنا کام چلا لے گا۔ جب ہم لوگ اس کی تو تلی زبان سے ایسے فقرے سنتے ہیں تو یہ ہم کو بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہم اس کو بار بار اُکساتے ہیں کہ وہ دوبارہ انہی الفاظ کو ادا کرے اور جب وہ ہماری خواہش کو پورا نہیں کرتا ہے تو ہم خود اس کے ہی تو تے الفاظ کو ادا کر کے اس کو اسی طرح بولتے پڑے آمادہ کرتے ہیں۔ یہ کیسے؟ — تے ایک مثال سے سمجھیں — ایک ماں کا بچہ جب بھی پانی مانگتا ہے تو وہ "مم" کہتا ہے اور اب ماں بھی جب اس سے پوچھتی ہے تو یہی کہتی ہے "بیٹے مم بیو گے؟" اب آپ ہی بتائیے بھلا وہ کیسے جانے گا کہ صحیح لفظ "مم" نہیں پانی ہے؟ اگر صحیح لفظ پانی ہے تو اس کی ماں نہ کہتی؟ — یہ مثال تو صرف ایک لفظ کی ہے مگر تو تے بچوں کی بولی میں زیادہ الفاظ ایسے ہی ہوتے ہیں جو وہ اس طرح اختیار کر لیتے ہیں اور آپ سمجھتی ہیں کہ یہ تو بچے کی فطرت ہے۔ وہ تو تلائے گا اور پھر خود ہی صاف بولی بولنے لگے گا لیکن

یہ تو سوچئے کہ جتنے عرصے اس کو توتلانے کی ضرورت ہے، یعنی وہ صاف الفاظ ادا نہیں کر سکتا اس سے زیادہ عرصے کے لئے آپ اُسے توتلانے پر مجبور کیوں کریں۔

ہاں، یہ درست ہے کہ وہ ”مم“ سے پانی مراد لیتا ہے، لیکن جب آپ اس سے بات چیت کرتے وقت ”مم“ کے بجائے ”پانی“ ہی کہیں گی تو اس کے کان صحیح لفظ سے مانوس ہوتے رہیں گے اور ایک دن وہ پانی کہنا شروع کر دے گا۔ ایسے بچے جن کے ساتھ توتلا کر بات چیت نہیں کی جاتی ان کی بولی بہت جلد صاف ہو جاتی ہے۔

میں مانتا ہوں کہ آپ بھی جذبات رکھتی ہیں، اور کبھی آپ کا بھی دل چاہتا ہے کہ اپنے بچے کے ساتھ پیار اور محبت کی گفتگو کریں، ضرور کیجئے۔ یہ تو بڑی ضروری چیز ہے اور آپ کے فرائض میں سے ایک ہے۔ اگر آپ نے اپنے بچوں کے ساتھ ہی پیار اور محبت کا اظہار نہیں کیا تو کس کے ساتھ کریں گی؟ لیکن ذرا اس کا بھی جواب دیجئے کہ کیا پیار اور محبت کی گفتگو صرف تو تلی زبان میں ہی ہو سکتی ہے؟ کیا آپ صرف ”روٹی“ کو ”لوتی“ کہہ کر ہی اپنی محبت کا اظہار کر سکتی ہیں؟ کیا آپ ”لڑکا“ کو ”لڈکا“ کہہ کر ہی اپنا پیار جتا سکتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔ یہ الفاظ تو آپ کے منہ سے صرف یونہی نکل گئے تھے، محض اس وجہ سے کہ آپ کا بچہ صرف اس طرح کہتا رہے، مگر آپ اس پر قابو پانے کی عادت ڈالیے اور میرے ان کرم فرما کی سی ہٹ دھرمی نہ اختیار کیجئے جو مجھے تربیتی اصولوں پر عمل کرنے کی تلقین کیا کرتے ہیں، لیکن خود یہ بات کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اگر بچے سے تولا کر بولا گیا تو بچہ توتلا ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں کی گودوں میں پرورش پائے ہوئے بچے سات آٹھ سال کی عمر تک عموماً توتلا کر بولا کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے والدین ان کے اس طرح بولنے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو اسی طرح بولنا چاہیے تاکہ ان کے والدین کو ان پر اس سے زیادہ پیار آئے۔ زیادہ سے زیادہ پیار حاصل کرنے کے لئے اس سے آسان طریقہ اور کون ہو سکتا ہے؟ چنانچہ وہ جی بھر کے توتلاتے ہیں اور والدین سمجھتے ہیں کہ ابھی وہ بچہ ہے، جب سمجھا رہا ہو جائے گا تو خود ہی تھوڑے گا، مگر اس عادت کو تھوڑنے کا وقت تو ایک عرصہ ہوا گزر گیا اور



محض آپ کی خوشنودی کی خاطر وہ اُسے عزیز رکھے ہوئے ہے تو پھر کیوں نہ آپ اس کا علاج کیجیے، اور یہ بتائیے کہ آپ کو اس پر پیار اس تو تلے پن کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی کچھ اور ہی خوبیوں کی وجہ سے آتا ہے۔

مگر ایسا بھی نہ کیجیے کہ اُسے ایسا بزرگ اور عمر سیدہ سمجھنے لگیے کہ وہ تو تلامی اور آپ وعظ کہنا شروع کر دیں۔ اس طرح تو آپ اس کو وقت سے پہلے بڑا بنانے کی کوشش کریں گی، اور وہ اس کے لئے تیار نہ ہوگا کہ اپنے بچپن سے ہاتھ دھو بیٹھے مثلاً ایسے والدین جو اپنے بچوں کو ہر وقت غیرت دلایا کرتے ہیں اور شرم دلایا کرتے ہیں کہ "تو اتنا بڑا ہو گیا اور تجھے تمیز نہیں آئی"۔ "لومڑ ہو کر تجھے شرم نہیں آئی" وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا وہ واقعی بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے بچوں پر نظر ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ان کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ ہو رہا ہے۔ اب وہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے والدین پر ثابت کرے کہ وہ ابھی بچہ ہے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک طریقہ جو وہ اختیار کرتا ہے وہ تو ملانا ہی ہے۔ ایسے ہی بچے وہ ہوتے ہیں جن کی عمر ابھی دو ڈھائی سال کی ہی ہوتی ہے لیکن گھر میں ایک مٹنے بھائی کے آجلنے کی وجہ سے اس محبت کے حقدار نہیں رہتے جو ان کو پہلے حاصل تھی، اور پھر اس پر طرہ یہ ہوتا ہے کہ گھر والے اس سے کہتے ہیں: "دیکھو تم مان جاؤ، تم تو بڑے ہو اور مٹنا چھوٹا ہے"۔ مگر وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ بڑا ہے اور مٹنا چھوٹا ہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی ماں اس سے بھی اتنی ہی محبت کرے جتنی وہ مٹنے سے کرتی ہے۔ چنانچہ اپنے کو چھوٹا ثابت کرنے کے لئے وہ تو ملانے لگتا ہے۔ ایسے بچے آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ کس طرح تو ملانا چھوڑ دیں گے؟ اگر انھیں بچہ سمجھ لیا جائے! انھیں ان کی کھوئی ہوئی محبت مل جائے!

چنانچہ ان کا علاج ان کی عمر اور ان کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کیجیے۔ اب آئیے اس بارے میں سوچیں کہ بچہ پر کلانے کیوں لگتا ہے؟ فطری نقص کو اس معاملے میں بھی مجبوری سمجھ کر صابر و شاکر ہو جائیے، لیکن ان ہلکے بچوں سے غافل نہ ہوں جو بعد میں اس بڑی عادت کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ان سطروں میں ہم ایسے ہی بچوں سے

سروکار رکھیں گے۔

چار پانچ سال کی عمر تک بچہ تقریباً دو بار ضرور ہکلاتا ہے۔ یہ اس کے لئے فطری بھی ہے اور ضروری بھی! — اپنے بچے پر غور کیجیے — جب وہ ایک ایک لفظ ”مم“ ”لوتی“ ”اٹو“ ”ڈوڈو“ کہنے کے بعد ان سے جملے بنانے کی مشق کرنے لگتا ہے، اور ”لوتی لاؤ۔“ ”مم ڈوڈو پیس“ وغیرہ بولنا چاہتا ہے تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا ہے۔ اکثر یہ جملے پورے کرنا بڑا وقت لے لیتا ہے اور صاف ظاہر ہونے لگتا ہے کہ وہ ہکلا رہا ہے، اس کی یہ ہکلاہٹ تین چار پانچ چھ ہفتے ہی رہتی ہے لیکن اگر اس وقت آپ ہوشیاری سے کام نہ لیں تو اس کے ہکلتے ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

سب سے پہلا کام جو آپ اس کے لئے کریں وہ یہ ہے کہ جب وہ جملوں پر مدد اٹکنے لگے، اور لفظ جلدی اس کے ذہن میں نہ آسکے تو آپ اس کی مناسب موقعوں پر مدد کریں اور خود اُسے وہ لفظ بتادیں جس کی وجہ سے جملہ پورا کرنے میں وقفہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنا جملہ بہت جلد پورا کر سکے گا، اور اُسے ہکلا نا نہ پڑے گا، مگر اس کا خیال رکھیے کہ ہر وقت آپ ہی لقمہ نہ دیتی رہیں۔

دوسرے اس کا خیال رکھیں کہ جن لفظوں کو کہتے ہوئے وہ ہکلاتا ہے انہیں اسے کہنے کے لئے مجبور نہ کیجیے، اگر وہ نہ کہہ سکا اور شکست مان لی تو پھر سمجھ لیجیے کہ وہ عمر بھر کے لئے ہکلا ہو گیا — کیا کہا آپ نے؟ — یہ میں نے بڑی عجیب بات کہی؟ — جی نہیں! آپ ان لوگوں کی مثال کیوں سامنے رکھتی ہیں جو زبردستی بچے کی زبان کو مداری کا کھیل بنانے پر مجبور کرتے ہیں؟ وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جس لفظ کی مشق بچہ کرے گا وہ اس کو ضرور یاد ہو جائے گا۔ انہیں کیا معلوم کہ اگر بچے کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ وہ ہکلا ہے اور یہ مجبوری ہے تو پھر وہ کبھی بھی مربوط اور زوال جملہ نہ بولے گا۔

آپ اُسے یہ احساس ہی کیوں دلائیں کہ وہ ہکلا ہے، اس سے آپ کو یا اس کو کیا فائدہ ہوگا؟

لیکن جب یہ زمانہ گزر جائے گا تو پھر ایک بار آپ کو چار پانچ سال کی عمر میں اس

کے اسی نقص کا سامنا کرنا پڑے گا اور دراصل یہ وہ زمانہ ہوگا جب آپ کو بے انتہا احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اگر اس زمانے میں آپ کی توجہ میں کمی رہ گئی تو سمجھ لیجیے کہ بنا بنا یا کھیل بگڑ گیا۔

بیتا یہ ہے کہ چار پانچ سال کی عمر میں بچے کے پاس خیالات تو بہت سے ہوتے ہیں لیکن الفاظ اتنے نہیں ہوتے کہ وہ اپنے خیالات کو روانی کے ساتھ ادا کر سکے چنانچہ تھوڑا بہت کہنے کے بعد اسے اور الفاظ سوچنے کے لئے رکنا پڑتا ہے یہ رکنا ہی اس کی ہکلاہٹ ہوتی ہے۔ آپ بھی تو بعض اوقات بات کرتے کرتے ایک دم ہکلانا شروع کر دیتی ہیں اور لاکھ کوشش کرتی ہیں کہ کوئی لفظ آپ کی زبان تک آجائے اور جملہ پورا ہو جائے مگر وہ لفظ ہے کہ کسی طرح منہ تک آتا ہی نہیں!۔ یہی کیفیت اس چار پانچ سال کے بچے کی ہوتی ہے۔ ایسے وقت پھر آپ انہی باتوں کا خیال رکھیے جن کا آپ پہلی بار کے ہکلمے پن میں خیال رکھ چکی ہیں یعنی اس کو لفظوں کی کمی کی شکایت نہ ہونے دیں اور اسے خود کو ہکلا نہ سمجھنے دیں۔ یوں اس کی شکایت خود بخود زور ہو جائے گی۔

مگر ابھی کچھ اور وجہیں بھی بتانی ہیں جو بچے کو ہکلا بنا دیتی ہیں۔ ان پر بھی غور کرتی چلیے :

جو بچے بڑی جلدی جوش میں آجاتے ہیں ان کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ بات کرتے کرتے ہکلمے ہو جاتے ہیں اور پھر ایک وقت وہ آتا ہے جب یہ ان کی عادت بن جاتی ہے۔ اس کا علاج تو آپ جان ہی گئی ہوں گی!۔ بڑا آسان ہے!۔ بچے کو جوش میں نہ آنے دیجیے۔ ہکلا پن پروان نہ چڑھ سکے گا اور جوش میں آنا یوں بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ایسا بچہ جو کسی چیز سے خوف کھاتا ہے وہ اس کی موجودگی میں ہکلانے لگتا ہے۔ اب اگر وہ خوف دلانے والی چیز جلد جلد اس کے سامنے آیا کرے تو وہ مستقلاً ہکلا ہو جائے گا۔ مثلاً بچہ اگر کسی شخص سے بہت زیادہ ڈرتا ہے تو وہ اس کی موجودگی میں بول نہ سکے گا اور اگر

بولنا چلبے گا تو اُس کو الفاظ میسر نہ آئیں گے، اور وہ ہکلائے لگے گا۔ ایسی صورت میں کرنا یہ چاہیے کہ بچے کے خوف اور ڈر کو رفتہ رفتہ کم کیا جائے۔ ایسا شخص جس سے بچہ ڈرتا ہے وہ بچے کو بولنے پر مجبور نہ کرے بلکہ وہ بچے کے ساتھ خوش مزاجی کے ساتھ پیش آئے۔ بچہ خود بخود ہکلا نا چھوڑ دے گا۔

ایسے بچے جن کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر سزا ملتی رہتی ہے اور ان کے ساتھ کوئی ہنس بول کر بات کرنے والا نہیں ہوتا ہے، ہکلائے لگتے ہیں۔ ان کی اس تنہائی کو دور کر دیجیے، وہ ہکلا نا چھوڑ دیں گے۔

ہاں یہ بھی ہے کہ جس طرح بچہ اپنی اہمیت کو کھو کر تو تھلا نا شروع کر دیتا ہے اور نئے آنے والے ”منے“ کے برابر چھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح وہ اس محبت اور توجہ کی کمی کی وجہ سے ہکلائے بھی لگتا ہے۔ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لئے جلد جلد بولنے کی کوشش کرتا ہے، اونچا بولنے کی کوشش کرتا ہے، اور کبھی کبھی جوش میں بھی آجاتا ہے، یا پھر بوکھلائے بوکھلائے سے انداز میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ ایسا محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ آپ اس کو پھر سے اپنا پیارا بچہ مان لیں۔ چناں چہ نتیجہ میں وہ ہکلا ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے کا علاج یہی ہے کہ اس کے حصے کی محبت اس کو پوری مل جائے، پھر وہ نہ ہکلائے گا۔

جب بچے ہکلائے لگتے ہیں تو گھردالوں پر نہ معلوم کیوں بوکھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے، اور سب کے سب ہکلتے پن کے چھپے اس طرح نیچے جھاڑ کر پڑ جاتے ہیں جیسے اُس ناخواندہ مہمان کو فوراً کے فوراً نکال باہر کر کے چھوڑیں گے۔ لیکن ٹھہریے! اُسے اپنا بوریا بستر باندھ لینے دیجیے!۔

یہ کیا فضول بات ہے؟ — نہیں محترمہ! میں سچ کہہ رہا ہوں، بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ غور کیجیے۔ یوں ہی تو ہوتا ہے تاکہ جیسے ہی بچہ ہکلا یا فوراً کسی نے ٹوک دیا۔ ”پھر تو ہکلا یا؟ — نہ چھوڑے گا اپنی عادت؟“ — بھلا ایسے بھی کہیں ہکلا نا چھوڑتا ہے؟ — اگر یوں یہ نقص دور ہو جاتا تو شاید دنیا میں کوئی ہکلا ہی نہ ہوتا۔

اس کے علاج کا تو مناسب طریقہ یہی ہے کہ پہلے مرض کی وجہ معلوم کی جائے اور اس کے بعد اسے دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہاں! تو آپ اپنے بچے کو یا کسی بچے کو ہکٹے پن پر نہ ٹوکیے گا اور ہکٹے بچے کو چڑانا بھی تو اچھا نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ شرمندگی محسوس کرتا ہے اور خود کو اس کی اصلاح کے لئے مجبور پا کر اپنی ناکامی پر تکیہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ عمر بھر کے لئے ہکٹا ہو جاتا ہے اور پھر کسی کی نقل اتارنا کب اچھی بات ہے! اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس بُری حرکت سے سخت منع کیا ہے :

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، نہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، نہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بُری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔“

(المحجرات: ۱۱)

## چند لفظوں میں

- جب بچہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ وہ اس مشکل کا مقابلہ کس طرح کر رہا ہے۔ اگر یہ مقابلہ وہ غلط طریقے سے کر رہا ہے تو اس کی رہنمائی کیجیے۔
- بچہ جب سوچنا شروع کرتا ہے تو مشکلات ضرور پیش آتی ہیں۔ آپ کا کام صبر و استقامت سے اُس کی طرف توجہ دینا ہے۔

## دودھ چھڑانا

- خیال رکھیے کہ بچہ دودھ پیتے وقت آپ کے پیار سے تھپکنے، لوریوں اور محبت بھری

گود سے بھی لطف حاصل کرتا ہے۔ کہیں اُسے آپ ان چیزوں سے محروم تو نہیں کر رہی ہیں؟

○ دو سال سے زیادہ عمر تک دودھ پلانے رہنے سے بچے کی خود اعتمادی پر اثر پڑتا ہے۔ اس میں غیر ذمے داری اور بے پروائی پیدا ہو جاتی ہے۔

○ وقت سے بہت پہلے دودھ چھڑا دینے اور توجہ کم کر دینے کی وجہ سے بچہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت خوف زدہ سا رہنے لگتا ہے۔

○ دودھ چھڑاتے وقت کسی طرح یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ کی محبت میں کمی ہو رہی ہے۔

○ جب وہ اپنے دانت استعمال کرنے کے قابل ہو جائے تو ان دانتوں کو کام میں لانے کے لئے اُس کی ہمت افزائی کریں۔

## بستر خراب کرنا

○ ضروریات سے فارغ ہونے کے سلیقے کی عادت ڈالنے کے لئے بچے کی اُس وقت فوراً مدد کیجیے جب وہ حاجت محسوس کر رہا ہو۔

○ سونے سے پہلے بچے کو پیشاب وغیرہ سے فارغ کر دیجیے۔

○ بچہ اگر خوف سے پیشاب کر دے تو اُسے سرزنش کرنے کے بجائے خوف سے نجات دلائیے۔

○ اگر بچہ ڈر، خوف یا غلط عادت کی وجہ سے بستر پر پیشاب کر دیتا ہے تو اُس کی ذات میں دل چسپی لیجیے۔

○ بستر خراب کر دینے والے بچے کو صفائی ستھرائی کی برابر تلقین کرتی رہیے، تاکہ وہ اپنے غلط طرز عمل کی بُرائی سمجھ سکے۔

○ بستر پر پیشاب کر دینے والے بچے کا مذاق نہ اڑائیے، اس کی شخصیت مجروح ہوگی اور اُس میں کوئی دوسری خرابی پیدا ہو جائے گی۔

## توتلانا اور ہکلانا

- توتلے پن یا ہکلے پن کی مستقل نقل سے یہ عیب پختہ پڑ جاتے ہیں۔
- بچے کو توتلی زبان کے بجائے صحیح زبان سکھائیے، ورنہ وہ آپ کی خوشنودی کے لئے توتلا ہو جائے گا۔
- بچہ اگر دوبارہ توتلے پن کی طرف لوٹ رہا ہے تو وہ آپ کی محبت چاہتا ہے۔ اس کو پہلی سی محبت پھر چاہیے۔
- گھبرائیے نہیں، پانچ سال کی عمر تک بچہ دوبارہ ہکلاتا ہے۔ مگر یہ عرصہ صرف چند ہفتوں کا ہوتا ہے، شرط یہ ہے کہ آپ توجہ اور استقلال سے کام لیں۔
- جب بچہ مناسب لفظ کی تلاش میں ہکلانے لگے تو آپ مناسب لفظ فراہم کر کے اس کی مدد کریں۔
- جن الفاظ کو ادا کرتے ہوئے بچہ ہکلانے لگتا ہے انہیں بار بار کہنے پر مجبور نہ کریں۔
- بچے کے جذبات کو محبت کی کمی، خوف، غصہ یا خوشی کی وجہ سے بے انتہا بھڑکنے کا موقع نہ دیں، ورنہ خطرہ ہے کہ وہ ہکلانے لگے۔
- ہکلاتے وقت بچے کو ٹوکیے نہیں، چڑھائیے نہیں ورنہ وہ کم ہمت ہو جائے گا اور اپنی عادت نہ چھوڑ سکے گا۔

# بچے کی ناشائستہ حرکیں

ابھی تک بچے کی جن ناپسندیدہ حرکتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے وہی ساری کی ساری نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی ہیں جو آپ کے لئے خلیجان بن جاتی ہیں۔ ناشائستہ حرکتوں میں سب سے زیادہ فکر کا باعث تو وہ ہیں کہ جن کو آپ ہر طرح سے بچے کی ذات سے دُور کرنا چاہتی ہیں لیکن بچہ ہے کہ وہ ان سے اور بھی زیادہ چمٹتا جاتا ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ دوبارہ وہ شرارت نہ کرے، لیکن وہ آپ کی سخت سے سخت تادیب کو بھول جاتا ہے اور وہ وہی کچھ کر گزرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کبھی تو شاید آپ کو یہ احساس بھی ہونے لگتا ہے کہ جیسے بچہ اس حرکت کو اچانک کر گیا ہو اور گزرنے کے بعد اس کو بے حد قلق پورہا ہو، مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ بچہ ایسی حرکت ہی نہ کرے؛ بلکہ آپ نے اس طرح سوچا ہو گا اور سوچتی ہیں لیکن کوئی حل نظر نہیں آتا۔

اب میں ان ناشائستہ حرکات کی وجوہ اور ان کے حل کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میں ان اہم باتوں کی طرف آپ کو متوجہ کروں چند ایک اس سے بھی زیادہ اہم باتیں آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ گویا یہ وہ آلہ ہیں جس کے ذریعہ آپ صحیح طور پر دیکھ سکیں گی کہ اس کی کون سی حرکت واقعی ناشائستہ ہے؛ اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ اس کے بچپن کی بھولی بھالی باتوں کو بھی معیوب قرار دیے دے رہی ہیں۔

ایک محترمہ ایک بار اپنے کسی عزیز کے یہاں ملنے کے لئے گئیں؛ اس میزبان



خاندان میں حسن اتفاق سے کوئی کم عمر بچہ نہیں تھا اور وہ لوگ معصوم بچوں کی پیاری پیاری باتوں کے ہمیشہ متنی رہا کرتے تھے۔ جب ان محترمہ کے ساتھ ان کی چھوٹی بچی بھی ان کے یہاں پہنچی تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ وہ سب برابر یہ کوشش کرتے رہے کہ بچی ان کے ساتھ بے تکلف ہو جائے۔ چنانچہ وہ اُسے کھانے پینے کی چیزیں پیش کرتے رہے اور مختلف طرح کی باتوں کے لئے اُسے رُکھتے رہے۔ لیکن یہ محترمہ کچھ اس قدر بچی کی طرف سے ناگاہک تھیں کہ جہاں اُس نے کوئی بات کی فوراً گھڑکی سنانی:

”بد تمیز کہیں کی کترنی کی زبان چلائے جا رہی ہے۔“ اور پھر مینز بانوں سے کہتیں: ”کیا بتائیں سن! اس پڑیل کی وجہ سے ہی تو میں نے سب کہیں کا آنا جانا ترک کر دیا ہے۔ جہاں جاتی ہے تمیز سے پیش ہی نہیں آتی۔ بس اس کی وجہ سے مارے شرمندگی کے سر نیچا ہو جاتا ہے۔“

یا پھر جیسے ہی کسی نے اُسے کوئی چیز دینی چاہی اور اس نے لینے کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ برس پڑیں ”چل وہاں سے ندیدی کہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کبھی زندگی میں دیکھا ہی نہیں ہے۔ تو تو ہر جگہ مجھے ذلیل کرانے پر تلی ہوئی ہے۔“

اب آپ ہی بتائیے کہ محترمہ یہ کس آنکھ سے اپنی اس بچی کی تمام حرکتوں کو دیکھ رہی ہیں؟ اور کیا ان کا یہ سوچنا درست ہے کہ بچی کی ہر حرکت ناشائستہ ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو بچی کی تمام حرکات کو بچکانہ حرکات سمجھ کر توجہ دینا بے حد ضروری ہوگا۔ ورنہ بہت بڑا خسارہ اٹھانا پڑے گا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنا بے حد ضروری ہے کہ وہ بچہ جو بالکل گم گم اور سیدھا سادہ رہتا ہے، دراصل اس میں کوئی نقص یا خرابی ہے۔ بچپن کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ بچے کی نش فٹس میں چلبلاپن اور پھر تیلپن بھرا رہتا ہے، جس کی وجہ سے وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہے۔ اب اگر وہ خاموش بیٹھا رہے اور بڑا سیدھا سادا یا بھولا بھالا بنا رہے تو سمجھ لیجئے کہ بچپن کا وہ چلبلاپن اور پھر تیلپن جو اس کے ہاتھوں کو دماغ کو نظر کو اور دوسرے تمام متوجہ ہونے والے اعضاء کو مشغول رکھتا ہے لاپتہ ہے۔ اس لئے

اس کو کم از کم اتنا موقع تو ملے کہ وہ اپنے ان اعضاء کو جو اُسے بے چین رکھتے ہیں استعمال کر سکے۔ یہ بات تو بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ہے۔ اس لیے فی الحال آئیے ان باتوں پر غور کریں جن کی آپ اس وقت ضرورت محسوس کر رہی ہیں۔

## بچہ اور سزا

ایک مرتبہ بہت سے بچے جمع ہوئے تو ان کو ایک کہانی سنائی گئی۔ کہانی زیادہ لمبی چوڑی نہیں ہے۔ اس لئے آپ بھی سن لیجئے :

ایک بچہ اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا، اس کی ماں نے اُس سے کہا کہ جاؤ بازار سے ترکاری لے آؤ، تمہارے ابا آتے ہوں گے۔ آتے ہی کھانا طلب کریں گے بچہ کھیل تو رہا ہی تھا، ماں کی بات پر دھیان نہ دیا اور ٹال گیا۔ جب اس کا باپ گھر آیا تو اس کی ماں نے اس کی شکایت کی — اب کہانی کہنے والے نے بچوں سے کہا کہ اس سے پہلے کہ میں تم کو یہ بتاؤں کہ اس کو کیا سزا دی گئی، تم خود ہی تجویز کرو کہ بچے کو کیا سزا دی جائے؟ اور ہاں یہ بھی سنو کہ باپ کے ذہن میں تین طرح کی سزائیں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ اگلے روز بچے کو تفریح کے لئے لے جائے اور انا تھا تو وہ اُسے نہ لے جائے۔ دوسری یہ کہ وہ ترکاری لئے نہیں گیا تھا، اس لئے اس کو کھانے میں ترکاری نہ دی جائے۔ تیسری یہ کہ جب اُس نے بڑوں کے کام کرنے سے انکار کر دیا تو بڑے کیوں اس کا کام کریں؟

ان بچوں میں جو چھ سات سال کی عمر سے کم کے تھے انہوں نے اُس بچے کے واسطے بڑی سخت سزائیں تجویز کیں۔ مثلاً اس کو اندھیری کو ٹھہری میں بند کر دیا جائے یا اس کو اتنا مارا جائے کہ وہ پھر عمر بھر نہ بھولے۔ یا پھر یہ کہ اس کا کھانا بند کر دیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے ابا جان نے جو سزائیں تجویز کی ہیں ان میں سے کون سی سزا دی جائے؟ تمام چھوٹے بچوں نے یہ کہا کہ اسے تفریح کے لئے نہ لے جایا جائے، لیکن بڑے بچوں نے یہ کہا کہ یا تو اسے ترکاری نہ دی جائے یا اس کا کام نہ کیا جائے تاکہ اس کو اپنے کئے کی سزا مل جائے اور وہ یہ جان جائے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

اب آپ کو شاید اچھی طرح علم ہو گیا ہو کہ چھوٹے بچے نافرمانی اور حکم عدولی کو کتنا بڑا جرم سمجھتے ہیں اور بزرگوں کا کہنا ماننا کتنا ضروری خیال کرتے ہیں؟ لیکن کیا ہم نے بھی کبھی سوچا کہ سزا ایسی کون سی ضروری چیز ہے؟ — جی ہاں، جو اب تو بڑی جلدی دستیاب ہو گیا! — بچے کے بھلے کے لئے ہی تو اس کو سزا دی جاتی ہے، ورنہ کسی کو بچے سے بیز تو ہے نہیں!

بات بالکل مناسب ہے سزا ہونی بھی اسی لئے چاہیے۔ مگر ایک سوال اور بھی ذہن میں ابھر آیا ہے، ذرا اس پر بھی غور کرتی چلیے — آپ بچے کو سزا اسی لئے تو دیتی ہیں کہ اس کو آپ کے اس ناپسندیدہ کام سے نفرت ہو جائے نہ کہ اس بستی سے جو اس کو سزا دیتی ہے؟

جواب دینے کے لئے تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ سوال مشکل نہیں ہے۔ لیکن جہاں سزا کو عمل میں لانے کا مرحلہ پیش آتا ہے، یہ خاصا ٹیڑھا مسئلہ بن جاتا ہے۔ کیسے؟ — یہ بھی سن لیجیے۔ ایک استاد عام طور سے بچوں کی مرمت کیا کرتے تھے، اور بعض وقت تو اس قدر مرمت کرتے تھے کہ بات تو معمولی ہوتی تھی لیکن سزا اتنی سخت ہوتی تھی کہ اسٹرکی پناہ! — ان کے بارے میں ایک بار میں نے بچوں کو کہتے سنا کہ اگر وہ اتنی سزا دیں گے تو ہم بھی کام نہ کریں گے اور کبھی نہ کریں گے، وہ خواہ کتنا ہی مار لیں۔ آخر ایسی بغاوت کا اعلان کیوں کیا گیا؟ جس طرح ہم اپنی عزت رکھتے ہیں اور دوسروں کے سامنے سوا ہونا پسند نہیں کرتے

اُسی طرح بچے بھی اپنی عزت اور اپنا وقار رکھتا ہے۔ اب جب وہ کوئی بُرا کام کرتا ہے تو آپ اُسے سزا دیتی ہیں۔ گویا اس کی عزت اور پندار پر زرد پڑتی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ کام اتنا بُرا ہے کہ اس کے بدلے دوسروں کے سامنے اپنی عزت جانی ہے تو وہ اس کام سے توبہ کر لیتا ہے، لیکن جب کوئی بار بار اس کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور بچے یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب دوسروں کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت ہی نہیں رہی ہے تو وہ ڈھیٹ اور بڑیا ہو جاتا ہے اور اب آپ اُس کو بُرے کام سے نہیں روک سکتیں۔

یہ تو ایک وجہ تھی مستقلاً سزا کے مستحق کام کرنے کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اب اچھی

طرح محسوس کرنے لگتا ہے کہ سزا دینے والے کے دل میں اس کے لئے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ پھر آخر وہ کیوں اس سے محبت کا دم بھرتا رہے؟ اس کے ڈر اوے میں آتا رہے؟ اور اس کی فرماں برداری کرتا رہے۔

ان حالات میں آپ دیکھتی ہیں کہ سزا دراصل بچے کی خرابی کی موجب بن جاتی ہے۔ وہ بچہ جس کو مار کھانے کی عادت ہو جائے اس کے لئے سزا کوئی بڑی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ وہ اُسے معمولی سی ایک چیز سمجھنے لگتا ہے۔ آج کل آپ دیکھتی ہیں کہ جیلوں سے کئی کئی سال کی سزائیں کاٹ کر نکلنے والے چور اور ڈاکو اپنے اس بُرے فعل پر اور بھی زیادہ جم جاتے ہیں اور جب قید سے تھوڑے پھوٹ کر آتے ہیں تو ان کی زبان سے یہی نعرہ نکلتا ہے کہ اب ڈر کس چیز کا ہے؟ سزا جب ملے گی تو ایسی ہی تو ملے گی جیسی پہلے ملی تھی، اس سے بڑھ کر اور کیا تکلیف دی جائے گی؟ چناں چہ اب وہ مہارت کے ساتھ اور دلیری کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں یہی معاملہ بچے کے ساتھ ہوتا ہے کہ جب اسے جاوے جا سزا دی جاتی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اب سزا اس سے بڑھ کر کیا ہوگی؟ تھوڑی دیر تکلیف ہی ہے۔ اس لئے سزا دیتے ہوئے اس امر پر پوری طرح غور کر لیجیے کہ آپ سزا اصلاح کے لئے دے رہی ہیں یا بگاڑ کے لئے۔

بہتوں کی تو زبان ہی اس فقرہ سے کھلتی ہے کہ ”ابھی دوں گی تھپڑ“ ”جوئی گھسیٹ کر ماروں گی“ لیکن بچے کو ہر وقت ہر سال کرتے رہنا کہاں تک درست ہے؟ اس سے بچے پر کیا اثر ہوگا؟ اس بات پر ذرا بھی غور نہیں کیا جاتا۔

بہت سے بچوں کے ساتھ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ان فقروں کو کہنے والے کا تکیہ کلام سمجھنے لگتے ہیں اور یہ باور کر لیتے ہیں کہ ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں لیکن کم ہی اپنے کہے پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ فقرے اپنا اثر کھودیتے ہیں اور بچہ سزا کی طرف سے ناغل ہو جاتا ہے۔

رہ گئے وہ بچے جو ان فقروں کو حقیقت سمجھتے ہیں، ان کا عالم دوسرا ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں اپنا ایک تجربہ ہی آپ کے سامنے رکھ دوں: ایک بزرگ نے مجھ سے ایک بار شکایت کی کہ وہ بچی پر کئی سو روپے برباد کر چکے ہیں لیکن تین سال سے اُسے

ابھی تک حروف پہچاننا نہیں آئے ہیں؛ نہ معلوم کیسی بچی ہے، ایک بات بھی تو اس کے ذہن میں نہیں ٹپکتی۔ ایسا کیوں ہے؟ میں نے کچھ دیر بیٹھ کر غور کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے گھر کے کونے سے غصے سے بھری ہوئی "بانیں" اور "کیوں"؛ کی گرج دار آوازیں اُٹھ رہی ہیں، اب بھلا ایسے ماحول میں بچہ اپنے ذہن کو کیسے متوازن رکھ سکے گا؟۔ شاید آپ میری بات سمجھ گئی ہوں۔

یہ سوچنا کہ بچہ کوئی ایسا کام ہی نہ کرے کہ اس کو سزا دینی پڑے، انتہائی خطرناک ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات آپ اپنی سزاؤں پر روک لگا دیں۔ بچہ ہر شہرت جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ بعض حرکتیں تو وہ بے ارادہ اس طرح کر جاتا ہے کہ ان کے ہونے سے پہلے اسے ان کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے اس سلسلے میں بڑا اچھا واقعہ بیان کیا تھا۔ ایک بچے نے اپنے ابا جان کی میز پر دیکھا کہ قلم دان میں سیاہ اور سُرخ دو آئیں قلم، پنسل، ربر، کاغذ تراش وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ بچہ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کو اٹھا لیتا ہے اور اپنی اسی عادت کے مطابق جس کا تذکرہ کئی بار ہو چکا ہے کہ وہ چیزوں کے بارے میں معلوم کرے کہ وہ کیا ہیں؟ وہ انہیں الٹا پلٹتا ہے۔ دوات کو اپنے ہاتھ پر اٹھ لیتا ہے۔ روشنائی اس کے ہاتھوں پر سے بہتی ہوئی کاغذ، قلم دان اور میز کا ستیا، اس کو دیتی ہے۔ بچے کو تو اس کی خبر بھی نہ تھی کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وہ گھبرا یا ہوا جلدی سے ہاتھ میں لگی ہوئی روشنائی کو تیس کے دامن میں پونچھ لیتا ہے۔ پھر گوشالی کے خوف سے ادھر ادھر گری ہوئی روشنائی کو کاغذ کے ٹکڑوں سے جلد جلد پونچھ کر صاف کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

اب آپ بھی خود غور کریں ایسے بچے کو سزا دینا گویا اس کو اور زیادہ خوف زدہ کر دینا ہے یا نہیں؟ اور کیا اس کو سزا دینا اس کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی؟۔ اُسے تو خود ہی اپنی غلطی کا احساس ہے۔

بچے کو جب ایک ناپسندیدہ کام پر سزا دینی جاتی ہے تو وہ کچھ دنوں کے لئے اس کے لئے اس کام سے دست بردار ہو جاتا ہے، لیکن پھر ایک دن وہ اس کام کو دوبارہ کر ڈالتا ہے اور اس کے والدین یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس نے عمداً ایسا کیا ہے۔ چنانچہ

اسے پھر سزا دے ڈالی جاتی ہے اور ساتھ ہی بے جیا، بے غیرت وغیرہ بھی بنا ڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ بچے اپنے دل میں یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ میں تو ایسا غلطی سے کر گیا۔ ایسے وقت اس پر ضرورت سے زیادہ عتاب اس کے لئے مناسب نہ ہوگا۔

سزا کا ضرورت سے زیادہ ہونا کبھی بھی مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک ہو سزا دینے کے بجائے ایسے طریقے استعمال کئے جائیں کہ بچے خود اس کام سے نفرت کرنے لگے۔ اگر اس نے غلطی سے کوئی ناپسندیدہ کام کیا ہے اور اس کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہے تو اس کو معاف کر دیجیے۔ اگر اس کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہو کہ اس کے بُرے کام سے الترمیمیاں تحفا ہو جائیں گے اور الترمیمیاں کی خفگی بڑی بھاری خفگی ہے تو اسی پر بس کیجیے۔ لیکن جب آپ بچے سے یہ کہہ دیں کہ ”اگر تم نے فلاں کام کیا تو میں تم کو پٹوں گی“ اور پھر وہ اس کام کو کر گزرے تو آپ ضرور سزا دیں۔ ایسے موقعوں پر گریز یا چشم پوشی سے جانتی ہیں کیا ہوگا؟ — بچہ یہ سمجھ لے گا کہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ امی نے یوں ہی کہہ دیا تھا، اور آئندہ بھی وہ کچھ نہ بولیں گی۔ بس یہی رُحمان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ دوسرے یہ بھی تو ہوتا ہے کہ وہ آپ کے اس عمل سے عہد کی پابندی میں کم زوری کا سبق بھی سیکھ لیتا ہے۔ ہمارے گھرانوں میں سزا کا ایک بڑا انداز پایا جاتا ہے جو شاید دنیا کے کسی اور خطے میں رائج نہ ہو۔ آپ تعجب کریں گی کہ آخر وہ کون سی سزا ہے جس کا وجود دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں، لیکن آپ بھی سنئے :

بچہ جب کوئی ایسی خطا کرتا ہے کہ اس پر تنبیہ کے طور پر سزا ضرور دی جائے مثلاً وہ دن بھر گھر سے غائب رہا ہے اور جب شام کو ابا جان کے آنے کا وقت ہوا تو وہ واپس آیا ہے۔ ماں اس سے لاکھ پوچھتی ہے کہ وہ دن بھر کہاں رہا ہے، لیکن وہ خواب ہی نہیں دیتا۔ آخر کار ماں زچ ہو کر باپ سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی بچہ کچھ نہیں بتاتا اور جب باپ آتا ہے تو ماں شکایت بھی کر دیتی ہے۔ باپ بچے کی اس حرکت کو انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کو سزا دینے کے لیے اٹھتا ہے۔ لیکن عین اُس وقت اماں جان کے دل میں بچے کی محبت جوش مارتی ہے اور وہ بچے کو بچانے اور چھپانے کی کوشش

کرتی ہیں۔ خود اس کی طرف سے معافی بھی مانگتی ہیں۔ غرض طرح طرح کی لغویات کر ڈالتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ جب تک اس کی اماں جان موجود ہیں اس کو سزا نہیں دی جاسکتی اور اماں جان سمجھتی ہیں کہ میں نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا۔ حالانکہ ان کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ اس طرح وہ بچے کو اکثر بڑی حرکات کرنے کی آزادی بخش دیتی ہیں۔

میری نظر میں ایسی اکثر مائیں ہیں جن کے اس غلط طرح کے رویے نے بچوں میں بعض اخلاقی بُرائیاں تک پیدا کر دی ہیں۔ ماں کو چلبیسے تو یہ تھا کہ یا تو وہ خود بچے کو سدھار لیتی، اُسے کچھ سزا دے دیتی یا پھر باپ کی تنبیہ میں دخل انداز نہ ہوتی۔ لیکن وہ اتنی دُور کی بہت کم سوچتی ہیں۔

بچوں کے معافی مانگنے پر ان کو معاف کر دینا بھی ایک طرح کی سزا ہے۔ مُراد یہ نہیں کہ یہ بُرا ہے بلکہ یہ بڑی اچھی سزا ہے۔ بچے جب اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا ہے اور معافی مانگتا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ وہ پہلے ہی اصلاح کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ اب اگر اس پر بھی سزا دی گئی تو یہ بچے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیے کہ سزا سے جہاں ہم بچوں کو سدھار سکتے ہیں وہاں ان کو بگاڑ بھی سکتے ہیں اور بگاڑنے سے یہ لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ہم ان کو سدھاریں۔

## بچوں کی سزا

ایک ماں اپنی بچی کی اس حرکت سے عاجز آگئی تھی کہ جس کام سے وہ اس کو منع کرتی وہ اُسے ضرور کرتی۔ اگر اس کے ساتھ سختی کی جاتی تو پھر وہ چھپ کر اس کام کو کرتی۔ اب ایسی بچی کے ساتھ وہ کیا کرے؟ یہ اس کا دل ہی جانتا ہوگا لیکن ہمارے بعض گھروں میں بھی بچے کی یہی حرکت بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

بچوں کی یہ حرکت جس قدر تکلیف دہ ہے اسی قدر یہ سادہ بھی ہے اور اس کا دور کرنا بھی اتنا ہی آسان ہے۔ لقص بچوں میں کیوں کر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اس خامی کے

سبب پر غور کر لیں تو اس کا دور کرنا بھی ہمارے لئے آسان ہوگا۔

بچوں میں ضد عام طور سے دو طرح سے پیدا ہوتی ہے :

اولاً اس طرح کہ بچہ کسی کام میں مشغول ہوتا ہے اور اچانک اس کو اس سے روک دیا جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اسے منع کیوں کیا گیا؟ اس کے کرنے میں آخراً قباحت کیا ہے؟ جب اس کا ننھا سا ذہن اپنے سوالوں کے جواب نہیں پاتا تو وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اور ادھر گھروالے سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ضد اختیار کر رہا ہے۔ اس لئے اسے اس سے باز رکھنے کے لئے سزا دینے تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ بچہ جب سزا پاتا ہے تو بے قصور پٹ جانا اس کو اور بھی ناگوار گزرتا ہے۔ آخر کوئی وجہ بھی تو ہو، مگر وجہ اس کو بتائی کہاں گئی؟ چناں چہ وہ کہتا ہے کہ اب جو مجھ کو بلا وجہ سزا دی گئی ہے تو میں اسے ضرور کروں گا۔ دیکھوں کہاں تک سزا دیں گے یہ لوگ؟

معاملہ اس قدر اُلجھ گیا، حالاں کہ بات بڑی معمولی سی تھی۔ اگر اس سے یہ کہہ دیا جاتا کہ ”میاں بھلی کے تاروں کو چھوؤ گے تو ہاتھوں میں جھٹکا لگے گا زور کا“ لیکن اس پر بھی وہ نہیں مانتا ہے۔ متعدد بار اس کی کوشش کرتا ہے کہ تاروں کو چھوئے تو آپ کسی دن ہوشیار رہتے ہوئے اس کی اس خواہش سے چشم پوشی کریں، اُسے تار چھو لینے دیں۔ میری مراد یہ نہیں کہ آپ اس کو اس طرح موت کے حوالے ہی کر دیں۔ خدا نخواستہ! بلکہ ایک معمولی سا جھٹکا پہنچ جانے دیں۔ اُسے خود ہی تجربہ ہو جائے گا اور آئندہ آپ پر اعتبار کرے گا۔

لیکن اگر بچے کی ضد پر اپنی ضد کو مقدم رکھا گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ آپ بہت سی باتوں کا آگاہی سوجھ سکتی ہیں لیکن بچے کا چھوٹا سا ذہن ابھی اتنی صلاحیت کہاں رکھتا ہے کہ آپ کی طرح بہت کچھ سوجھ جائے؟ وہ تو اکثر وقت کے وقت چیزوں سے نمٹنے کی کوشش کرے گا۔ آپ ضد کریں گی تو وہ اور بھی ضد کرے گا، یہاں تک کہ وہ اپنی بات پر پوری طرح اڑ جائے گا۔ آپ اگر اپنے اندر تھوڑی سی لچک پیدا کریں گی تو وہ بھی اپنے اندر لچک پیدا کرے گا۔

بچہ ضد اس لئے تو نہیں کرتا کہ وہ بات کو غلط بھی سمجھتا ہو اور پھر بھی اُسے اپناتے رہے



یہ اور بات ہے کہ آپ کی ضد کی وجہ سے وہ ضد کرنا اپنی خصلت بنالے مگر یہ حقیقت ہے کہ بچے کی ضد کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی بات کو صحیح سمجھ رہا ہے اور اس پر جفا ہوا ہے۔ ہم آپ سبھی یہ کرتے ہیں کہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں اُس سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے پھر آخر وہ کیوں فطرت کے خلاف کرے؟ اللہ تعالیٰ نے تو یہ صفت رکھی ہی اس لئے ہے کہ انسان اگر خیر کو اپنالے تو خیر کا ہو رہے اور اگر شر کو اپنالے تو شر کا ہو رہے، اس طرح اگر سرے سے بچے میں یہ صفت ہی نہ ہو تو وہ آئندہ زندگی میں کیسے کسی ایک رنج پر اطمینان قلب کے ساتھ جم سکے گا؟ اس لئے بجائے اس کے کہ اُس کے سامنے ضد پر لعن طعن کی جائے بہتر ہوگا کہ اس کی ضد کو کسی اور طرف موڑ دیا جائے۔

ضد کے سلسلے میں دوسری بات جو مجھے کہنی تھی وہ یہ ہے کہ جب بچہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب گھر والے اس کی طرف سے آہستہ آہستہ غافل ہونے لگے ہیں اور اب اُن کی نظر میں اس کی وہ اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے جو پہلے تھی تو وہ دوبارہ اپنی ذات میں دوسروں کے لئے دل چسپی پیدا کرنے کے لئے ضد کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بچہ ضد کرنے کے لئے زمین پر لوٹ جائے گا تو آپ اسے ضرور اُٹھائیں گی، خواہ پھر آپ اس کی اچھی طرح فرمت ہی کر دیں لیکن وہ اسی کو بسا غنیمت سمجھنے لگتا ہے کہ آپ نے اسے اس قابل تو سمجھا کہ زمین سے اُٹھائیں اور آپ کی مار؟ — جب پیار نصیب نہ ہو تو کیا بچہ مار کو بھی اپنی خوش نصیبی نہ سمجھے؟ —

ہم میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اگر اپنی اس زندگی پر نظر ڈالیں جب وہ ضد کرتے تھے تو وہ دیکھیں گے کہ جب اُن کا تذکرہ دوسروں کے سامنے ان الفاظ میں کیا جاتا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہی ضدی ہے تو اُن کو ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوا کرتا تھا کہ چلو ہمارا تذکرہ تو ہو گیا۔ اچھا نہ ہی بُرا ہی۔ یہ لوگ جو آج ہمارے ارد گرد طرح طرح کی بدعنوانیاں پھیلا رہے ہیں اُن میں سے نہ معلوم کتنے ایسے ہیں جو ضدی بچوں کی طرح خود کو مشہور کر رہے ہیں۔

اس طرح کی غلط شہرت سے ہمیں بچوں کو ہمیشہ بچاتے رہنا چاہیے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ بچہ یہ کیوں محسوس کرنے لگا ہے کہ دوسرے اس کی طرف سے نافل ہوتے چلے جا رہے

ہیں اور اگر اس کی شکایت درست ہے تو پھر کوشش کر کے اسے رفع کیا جانا چاہیے۔  
اگر ضد بیماری اور کم زوری کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے تو اس کا علاج کیجیے اور غذاؤں  
میں اس کے لئے ایسی چیزیں فراہم کرائیے کہ وہ توانا اور تندرست ہو سکے اور بات بات میں  
چتر چڑھے پن کا اظہار نہ کر سکے۔

بہت سے لوگ نہ معلوم کیوں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ضد کا علاج صرف یہ ہے کہ بچے کی  
ضد خواہ جا ہو یا بے جا پوری کر دی جائے۔ اس طرح ایک خرابی تو یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ بچہ  
سہل انگار ہو جاتا ہے اور ذرا ذرا سی چیز کے لئے مچل جانا آسان سمجھنے لگتا ہے۔ دوسرے  
اس کی ضدوں کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اس کا دماغ اس کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ  
ٹھنڈے دل سے یہ غور کر سکے کہ اس کی ضد کہاں تک مناسب ہے۔ اس لئے ضدوں کو پوری  
کرنے سے پہلے ضدوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کیجئے۔

ضدیں پیار اور شفقت سے جس قدر آسانی سے دور کی جاسکتی ہیں اتنی آسانی سے شاید  
کسی اور طرح دور کی جاسکیں۔ اس سے پہلے بھی آپ غور کر چکی ہیں کہ بچہ بعض حالات میں ضد اس  
لئے کرتا ہے کہ وہ بھوکا ہوتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی اگر اس کو مختلف موقعوں پر یہ سمجھایا  
جائے کہ اس کے ضد کرنے سے اس کے سر پرستوں کو کتنی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور  
کتنا نقصان ہو جاتا ہے تو ممکن نہیں ہے کہ بچہ اس کو اہمیت نہ دے بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنے کئے  
پر شرمندہ ہو جائے گا اور پھر اس کی امکانی کوشش کرے گا کہ کم سے کم ضد کرے۔

ضد کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بچہ ایک بار ضد کرنے کے بعد بھول جاتا  
ہے پھر وہ اس کو اسی وقت یاد آتی ہے جب اس کے لئے دوبارہ ضد کرنے کے مواقع فراہم کئے  
جائیں۔ اس لئے اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ بچہ ضدوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرے تو پہلے آپ  
اپنی ہی طرف سے کریں۔ اس کو کھیل وغیرہ میں اس طرح بہلائے رہیں کہ اس کا ذہن ضد کی طرف  
منتقل ہی نہ ہو۔

## بچوں میں غصہ

آپ ان چھوٹے بچوں پر جو بول نہیں پاتے ہیں، اگر غور کریں تو دیکھیں گی کہ بچہ

عموماً اس وقت روتا ہے جب وہ کسی چیز سے ڈر جائے یا کوئی چیز اس کے لئے ناگوار خاطر ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بچے کے رونے کی اور وجہیں نہیں ہو سکتیں؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان دو حالات میں اس کے لئے رو دینا ہی آسان ہوتا ہے۔

رو دینا گویا اس کی اپنی شکست کا اعلان ہوتا ہے۔ غصہ اس کو اسی وقت آئے گا جب وہ کچھ کرنا چاہے اور پھر اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی جائے۔ وہ اس پر بھی اپنی سی کرنی چاہے لیکن نہ کر پائے۔ آخر کار وہ جھجھلا جائے گا اور غصہ ہو جائے گا گویا اس نے ہار مان لی کہ اب وہ کسی اور طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

غصہ جب کسی کو آتا ہے تو وہ اپنے دماغ کو استعمال کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اب وہ تمام افعال اپنے جذبات ہی کی رو میں کرے گا۔ بچے کی یہ ذہنی کیفیت بھی پسندیدہ قرار نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنے دماغ کو کام میں نہ لائے حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صاف صاف الفاظ میں منع کیا ہے کہ غصہ مت کرو وغور کیجیے اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ غصے میں انسان کیا کچھ نہیں کر ڈالتا۔ لیکن اس پر بھی بعض گھرانوں میں یہ ایک مسئلہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کو موقع بے موقع چھیڑا جائے تاکہ وہ رو دے یا ناراض ہو جائے۔ اسے ایک طرح کا پیار یا شفقت خیال کیا جاتا ہے۔ خدا جانے یہ شفقت کس قماش کی ہے؟

صحت کے لحاظ سے بھی یہ چیز بڑی نقصان دہ ہوتی ہے۔ جب بچہ ناراض ہوتا ہے تو اس کے جسم میں ایک طرح کی اضافی توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب یہ توانائی بار بار پیدا ہوتی ہے تو جسم ہر وقت کی قوت کے بے جا صرف سے کمزور پڑ جاتا ہے اور بچہ چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس لئے بچے کو ناراض کرنے کے بجائے اسے بہلانا چاہیے، اس کو طرح طرح کے کھیلوں میں مشغول رکھنا چاہیے تاکہ اس کے دماغ کا رجحان اس طرف نہ ہو سکے، اور جب وہ ناراض ہو تو غیر حق کے خلاف ہو۔

بچے کے غصے کو رفع کرنے کے لئے یہ کتنا آسان ہے کہ اس کے سامنے اس کے اپنے پیارے نبی کا قول رکھا جائے کہ:

”غصہ پی جانے والے کو اللہ اجر دے گا۔“

اور پھر صبر اور تحمل کے ذریعے اس عمل کے کرنے میں اس کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے۔

صرف ایسا ہی نہیں ہے کہ جب بچے کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کی جائے تو وہ غصہ ہو بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اس کے گھر میں تند مزاج بزرگوں کی زیادتی ہوتی ہے تو بچہ بھی اپنے آپ کو اسی رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔ آپ کو ایک گھرانے کے بارے میں اگر نہیں یہ بتاؤں تو شاید میری بات سمجھنے میں آپ کو بڑی آسانی ہو جائے کہ ایک بزرگوار ریاست اور امارت کی شان اسی میں سمجھنے تھے کہ غصہ ہر وقت ناک پر رکھا رہے، وہ ہر بات پر لگڑ جانا گویا ایک وصف سمجھتے تھے۔ ایک بار کھانے میں سالن کم تھا، آپ نے بجائے اس کے کچھ کہیں طیش میں تمام پلیٹیں اٹھا اٹھا کر صحن میں پھینکنا شروع کر دیں اور چیتیاں کتنے کے سامنے ڈال دیں تاہم گھرانے کے اس عمل سے خوف زدہ ہو گیا۔ تین چار دن کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے کھانے پر بیٹھے۔ اس مرتبہ شاید کھانا تو بد مزہ نہ تھا۔ البتہ چاولوں کی پلیٹ آنے سے رہ گئی تھی، یا ایسی ہی کوئی بات تھی۔ چنانچہ آپ نے بھی تمام پلیٹیں اٹھا کر صحن میں پھینک دیں اور تنتنتے ہوئے باہر چلے گئے۔ غرض یہ بھی ایک طریقہ ہے، بچوں میں تند مزاجی کے بیج بونے کا۔

ایسا کرنے کے بجائے چاہیے تو یہ تھا کہ بچوں کے سامنے نہ تو غصے کا مظاہرہ کیا جائے نہ گھر کو جہنم زار بنایا جائے اور نہ کبھی اس طرح اس کے سامنے کہا جائے کہ اس کو تو خاندانی غصہ ملا ہے۔ اس کے باپ بھی اسی طرح ناراض ہوتے ہیں وغیرہ۔ ان تذکروں سے وہ سمجھتا ہے کہ جیسے اس کی خوبی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اس لیے اس کو اپنی اس خوبی کی پوری طرح پرورش کرنی چاہیے۔

چھوٹے بچے عام طور سے اس وقت بھی ناراض ہوتے ہیں جب وہ اپنی کسی ضرورت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسرے ان کی ضرورت کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسے مواقع پر بڑے تحمل سے کام لینا چاہیے۔ اگر بچہ اپنی بات سمجھانے میں ناکام ہو رہا ہے اور جھنجھلا رہا ہے تو آپ کبھی بھی ایسا نہ کیجیے کہ نہ سمجھ سکنے کی صورت میں خود بھی جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کریں۔

آپ کو چاہیے یہ کہ اپنی پیشانی پر ایک بھی بل نہ آنے دیں اور بڑے صبر و ضبط کے ساتھ اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کی ضرورت پوری کریں۔ بچے جب دو چار بار آپ کے اس طرح کے مظاہرے دیکھے گا تو وہ خود بخود سیکھ جائے گا کہ ناکامی کی صورت میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

بیماری کے زمانے میں بھی بچے عام طور سے چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ طرح طرح کی خواہشات کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا پورا کرنا ان کے لیے مضر ہوتا ہے۔ یا پھر ایک معمولی سی بات پر وہ خفا ہو جاتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تکالیف کی وجہ سے محبت کے زیادہ نوکر ہو جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کو معذور سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اس لیے اس زمانے میں ان کے ساتھ کچھ تھوڑی سی زیادہ توجہ کے ساتھ پیش آیا جائے تو وہ بیماری کو بھی جھیل لے جاتے ہیں اور چڑچڑے پن کو بھی دبا لیتے ہیں۔ میری ایک بہن کو ٹر فاطمہ مرحومہ نے اس برتاؤ کے ساتھ اتنی بڑی تکالیف کو جھیلنا ہے کہ شاید ایک سن رسیدہ شخص کے لیے بھی ممکن نہ ہوتا۔ وہ بہ یک وقت کئی امراض کا شکار تھی اور ہر مرض اپنی شدت پر تھا۔ خاص طور سے دل کی دھڑکن اتنی شدید تھی کہ جسم کا عضو عضو ہر دھڑکن پر ہل جاتا تھا مگر جب بھی اس سے کوئی حال پوچھتا تو یہ آٹھ نو سال کی بچی کہتی: "ابھی ہوں۔" زندگی کے آخری لمحات میں بھی جب کہ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی، ہم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر شکن نہ تھی اور اس نے اس طرح صبر کا مظاہرہ کیا کہ الفاظ بیان سے قاصر ہیں۔

اس تمام تذکرے سے میرا مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ابتداء میں بچے کے غصے کو اگر ہوشیاری سے دوسرے رخ پر موڑ دیا جائے تو بچے اس لعنت سے بچ جاتا ہے۔ کمزور اور ناتواں بچوں کا خاص طور سے لحاظ رکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ اپنی کمزوری کو غصے کا سہارا دیتے ہیں۔ ان کو اگر ایسے مواقع زیادہ پیش نہ آئیں کہ وہ ناکام ہوں تو غصے سے وہ کافی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ان کو ایسے ہی کاموں میں لگانا چاہیے جن میں وہ آسانی سے کامیاب ہو جائیں اور ایسے ماحول میں رکھا جائے جہاں دوسرے اس کی کمزوری سے

نا جائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔

## بچوں میں خوف

یہ کتنی عجیب بات ہوگی، اگر میں یہ کہہ دوں کہ خوف دو طرح کے ہوتے ہیں۔  
○ اللہ تعالیٰ کا خوف۔

○ اس کے مابوا چیزوں کا خوف

جی ہاں، اس وضاحت کے بعد یہ بات عجیب نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کا خوف تو آپ جانتی ہوں گی کہ ہر فرد کے لیے ضروری ہے، لیکن اس کے مابوا چیزوں کا خوف کیا معنی رکھتا ہے؟ ہمیں اسی مسئلے پر غور کرنا ہے اور اس طرح کے خوف کو جو بچوں کے دلوں میں بیٹھ جاتے ہیں دور کرنے کے بارے میں سوچنا ہے۔

بچہ پیدائشی طور پر کسی چیز سے خوف نہیں کھاتا بلکہ وہ اپنی گرد و پیش کی چیزوں کے معاملے میں یہ جانتا ہی نہیں کہ خوف کیا ہوتا ہے۔ آپ ایک تین چار ماہ کے بچے کو لے کر اوپر اچھالے وہ قطعاً نہ ڈرے گا۔ اُسے اندھیرے میں لے جائیے وہ ذرا بھی خوف نہ کھائے گا۔ لیکن ایک سات آٹھ ماہ کے بچے کو (جو ان چیزوں کا عادی نہیں ہے) اگر آپ اچھالیں گی تو وہ خوف کھائے گا، رونے لگے گا، یا اندھیرے میں جائے گا تو چیخنے لگے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ اس خوف کو آئندہ زندگی میں سیکھتا ہے۔ مثلاً اندھیرا ہی اس کے واسطے ایسی چیز ہے جس سے وہ واقف نہیں ہے۔ اندھیرا کیوں ہوتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟ اس کو اس کا علم نہیں۔ جس چیز کو وہ جانتا نہیں اس سے وہ آخر خوف کیوں نہ کھائے؟ مرزا پھو یا کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ جب انھوں نے بندوق خریدی تو اس احتیاط سے کوٹھری میں بند کر دی کہ کوٹھری کے دروازے تک جانے کی بھی کسی کو اجازت نہ تھی۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر کوئی کٹڈی کھٹکٹاے گا تو بندوق چل جائے گی (فائر کر دے گی) ان کو یہ خطرہ اس وجہ سے تھا کہ وہ بے چارے بندوق کا استعمال ہی نہ جانتے تھے۔ محض لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے خرید کر رکھ لی تھی۔ بالکل اسی مضحکہ خیز انداز میں بچہ اپنے لیے اجنبی چیزوں سے خوف کھاتا ہے۔

بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ اُس چیز سے بھی خوف کھانے لگتا ہے جس کو وہ اپنی قوت سے بھی بالاتر سمجھتا ہے۔ مثلاً ایسی چیزیں جو اس کو خود سے بہت بڑی نظر آتی ہیں۔ جیسے اکثر پالتو جانور! کچھ بچے ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو اونچی کرسیوں پر بیٹھنے سے ڈرتے ہیں۔ کیوں کہ اُن سے نیچے اترنا اُن کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

اس طرح کے خوف بچوں سے بڑی آسانی کے ساتھ دور کیے جاسکتے ہیں۔ اس ایک واقعے سے آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ سکتی ہیں۔

ایک بچہ اپنے سائے سے بہت گھبراتا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی اپنا سایہ دیکھتا ڈر کر بھاگتا۔ شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کا سایہ کوئی جن یا بھوت ہے۔ ایک ماہر نفسیات نے ایسا کیا کہ اس کے سامنے اپنے ہاتھ کا سایہ دیوار پر ڈالا اور پھر اس کو سمجھایا کہ سایہ کیوں بنتا ہے؟ اگر روشنی دائیں جانب سے آ رہی ہو تو سایہ بائیں جانب بنتا ہے اور اگر روشنی بائیں جانب سے آ رہی ہے تو سایہ دائیں جانب بنے گا جب بچہ سائے کی حقیقت سے واقف ہو گیا تو اس کے دل سے اس کا خوف بالکل جاتا رہا۔

لگے ہاتھوں ایک بچے کے حالات اور بھی معلوم کرتی چلیے۔ یہ بچہ اندھیرے سے نہ جانے کیوں بے حد ڈرنے لگا تھا۔ اپنی ماں کے لیے وہ ایک اچھی خاصی مصیبت بن گیا تھا۔ وہ بے چاری رات میں کوئی کام ہی نہ کر پاتی تھی۔ جہاں اندھیرا بڑھنا شروع ہوا اور بچے نے ماں سے چمٹنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ ماں ایسی نہیں تھی کہ بچے کے اس ناقص جذبے کو یوں ہی چھوڑ دیتی اور وہ اسے تمام عمر کے لیے ڈر پوک بنا دیتی۔ اُس نے اندھیری راتوں میں اس سے ہل چمکتے تاروں کی روشنی کا تذکرہ شروع کر دیا اور اُس دودھیار راستے کو دکھانا شروع کر دیا جس کو ہم آپ کہکشاں کہتے ہیں۔ بچہ ان چیزوں میں بڑی دل چسپی محسوس کرتا اور ایک کھیل تو بچے کو بہت ہی پسند آیا۔ اس کی ماں اُسے اندھیرے کمرے میں لے جاتی، وہاں وہ اُسے وہ گھڑی دکھاتی جس کے ہندسے روشنی میں چمکتے تھے۔ ان چمکتے ہوئے ہندسوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا اور پہروں ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا۔ اس طرح اس کا خوف کچھ عرصے کے بعد بالکل ہی جاتا رہا۔

خوف بچے میں اس طرح بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے خوف کے مظاہرے

کیے جاتے رہیں۔ اگر آپ بچے کے سامنے ایسی حرکات کرتی ہیں کہ جن سے آپ کے انتہائی خوف اور پریشانی کا اظہار ہو رہا ہو تو بچے بھی آپ کی نقل کرنے لگے گا۔ مثلاً ایک بچہ اپنے والدین یا بڑے بھائی بہنوں میں سے کسی کو بجلی یا گرج سے ڈرتے ہوئے کبل میں منہ چھپاتے یا کانوں میں انگلی دیتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بھی بغیر جانے بوجھے اس کی نقل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی ان چیزوں سے خوف کھانے لگتا ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ اس کی ذمے داری کس پر ہے؟ کیا یہ خوف بچے نے خود بخود اپنے اندر پیدا کر لیا ہے؟ نہیں، اس کی ذمے داری تو اس کے بزرگوں پر ہے وہ تو صرف ان کی نقل میں اس کا شکار ہو گیا ہے۔ اگر اس کے گرد و پیش میں خوف کو اہمیت دی جائے گی تو وہ بھی اس کو اہمیت دینے لگے گا۔

آپ جانتی ہیں کہ نقل کرنے کا جذبہ بچوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سیرت و کردار کا ایک بڑا حصہ بھی نقل کے ذریعے بناتے ہیں، اب آپ نے خوف کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بھی ان کے لیے شخصیت کی ایک خوبی بن جاتی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک تاثر بنیئر سوچے سمجھے بیٹھ جاتا ہے کہ جن چیزوں سے آپ ڈر رہی ہیں وہ یقیناً ایسی ہیں کہ ان کا مقابلہ اس کے بس کا نہیں ہے اور پھر جب آپ جیسی ہستیاں اس چیز سے ڈرتی ہیں تو وہ کس شمارہ قطار میں ہے۔

حالانکہ آپ کو اس طرح کی چیزوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ لیکن آپ ہیں کہ ایسی ایسی چیزوں سے ڈر بھی جاتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کہیں آپ کے شایانِ شان ہے؟ خدا کا بندہ اور کسی اور سے خوف کھائے؟ اس کے ذہن میں تو یہ خیال بھی نہ آنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور چیز اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور بھی ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ اللہ تعالیٰ نقصان پہنچانا ہی چاہے گا تو کیا کوئی چیز بچا سکتی گی۔ نہیں نہیں! کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ وہ تمام چیزوں پر قادر ہے اور تمام چیزیں اسی کے اشاروں پر اپنا فرض انجام دیتی ہیں۔ پھر جب یہ بات اتنی واضح ہے تو ہمیں اس کے علاوہ کسی اور چیز سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔

ٹھہریے! کہیں آپ خوف اور احتیاط کو گڈ ٹڈ تو نہیں کر رہی ہیں؟ آپ یہ خیال تو



نہیں کرنے لگی ہیں کہ میں آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ زبردستی سانپ کے منہ میں ہاتھ دے دیں اور کہیں کہ جب تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے اشاروں پر حرکت کرتی ہیں تو یہ مجھے اس کے حکم کے بغیر کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے۔ خوف تو اسے کہتے ہیں کہ کڑی کا جالا آپ کے ہاتھوں سے چھو جائے اور آپ ایک دم چیخ اٹھیں، تھر تھر کانپنے لگیں اور پسینے سے تر بہ تر ہو جائیں۔ اور احتیاط یہ ہے کہ آپ سانپ بھی دیکھیں تو آپ کی پیشانی پر بل نہ آئے اور ہوشیاری کے ساتھ اس موذی کو جان سے مار ڈالیں۔

اللہ تعالیٰ ذرا سی مصیبت پر بیخ اٹھنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ نہ خود ایسا ناقص عمل کریں جو بچوں کے لیے مضر ہو اور ان کو بزدل بنا دے کہ وہ زندگی میں آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی سکت ہی نہ رکھتے ہوں، کوئی بھی دشواری پیش آئے اور وہ کانپ اٹھیں، اور کسی طاقت ور سے مقابلہ پڑ جائے اور وہ لرز جائیں۔ جب منزل کی طرف اٹھتا ہوا ہر قدم ڈگمگا جائے گا تو آپ خود ہی سوچیں کہ منزل تک پہنچنا کیسے ممکن ہوگا؟ دوسرے یہ کہ آپ کو یہ بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ وہی قسم کے خوف اور بے جا خوف بچے کے دل میں نہ بیٹھیں۔ اس کے ذہن میں یہ بات ابتدا ہی سے بیٹھ جائے کہ نفع و نقصان پہنچانے والا خدا ہے۔ اس کے علاوہ تمام چیزیں بے بس ہیں۔ پھر آپ دیکھیں گی کہ بچے کس قدر نڈر اور باہمت بن جاتا ہے اور ایسے ہی بچے آئندہ زندگی میں کچھ کر جاتے ہیں۔

ہمارے گھرانوں کی خواتین اپنی آسانی کے لیے بچوں پر عجیب طرح کا ظلم کرتی ہیں۔ جب بچے کوئی شہرت کرتے ہیں اور انھیں سکون کی تلاش ہوتی ہے تو بے جھجک دھمکانی ہیں۔ ”نہ چپ ہوگا تو؟ اچھا، اری چڑیل لے جا اسے۔“ اور بچے ایک دم سہم کر رہ جاتا ہے۔ بڑی خائف نظروں سے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ کسی نہ کسی طرف سے کرہ اور بھیانک چڑیل کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنے کا منتظر ہو جاتا ہے۔ رات کو جب اُسے نیند نہیں آتی ہے اور وہ کھیلنا چاہتا ہے تو اُسے پھر دھمکی دی جاتی ہے کہ ”سو جاؤ، ورنہ دبے دوں گی بادیاں بی بی کو“ اور یہ بادیاں بی بی کیا ہوتی ہیں؟ وہ یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہتا ہے۔ البتہ ایک خوف سا اس کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ غرض کتنی ہی ایسی جان لیوا خیالی ہستیاں ہوتی ہیں جو اُس کو دہشت زدہ کیے رہتی ہیں۔

کبھی شیخ سدو، کبھی جن بابا، کبھی دیو، کبھی بھوت، کبھی فینٹم، کبھی ڈراکیولا، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے لیے ایک پریشانی کا موجب ہوتے ہیں اور ادھر گھر والوں کو امن نصیب ہو جاتا ہے مگر انھیں اس کی خبر نہیں ہوتی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

میری نظر سے ان ستم رانیوں کے شکار دو بچے گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک کا عالم یہ تھا کہ اُسے زندگی میں کوئی بھی رات چین سے سونے کے لیے نصیب نہ ہوتی۔ ہر رات وہ خوف زدہ ہو کر بڑبڑاتا تھا اور اکثر بستر چھوڑ کر اٹھ بھاگتا تھا۔ اور دوسرے کا عالم یہ تھا کہ اگر اچانک کوئی زور سے ہنس بھی دیتا تھا تو وہ خوف سے چیخ اٹھتا۔ ان مثالوں کو ذہن میں رکھیے اور کہیے کہ کیا ایک مسلمان کی کیفیت یہی ہونی چاہیے؟ اگر نہیں تو خدا را اپنے بچوں کو ان بے بنیاد ڈراووں سے محفوظ رکھیے۔

اگر بچوں کو بلاوجہ ہر وقت جھڑکا جاتا رہے، انھیں ہر وقت ڈانٹا جایا کرے اور ہر کام کے کرنے پر انھیں لال بلی آنکھیں دکھائی جائیں تو بھی ان کے اندر بے وجہ کا خوف بٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر کام کرتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس کرتے ہیں۔ انھیں یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ غلط تو نہیں کر رہے ہیں اور یہ چیز رفتہ رفتہ بڑھ کر خوف میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے صرف یہی ایک علاج کارگر ہے کہ آپ انھیں باز رکھنے اور منع کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ کہیں آپ محض حکم جتانے کے لیے تو ایسا نہیں کر رہی ہیں، یا کہیں آپ کی یہ عادت تو نہیں ہو گئی ہے کہ آپ ہر بات جھڑک کر کرتی ہیں، لہذا اس کے لیے آپ اپنے اس رویے کو بھی تبدیل کیجیے، ورنہ آپ ہی خسارے میں رہیں گی۔

آج کل کے ماحول میں خوف کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ خوف اپنے اوپر طاری نہیں کیا جاتا بلکہ انسان دشمن، سماج دشمن، امن دشمن لوگ ہم پر طاری کر دیتے ہیں۔ جب ہر طرف قتل و غارت گری ہو رہی ہو، بے قصور اور نہتے لوگوں کو زندہ جلایا جا رہا ہو، عورتوں کی عصمتیں ٹوٹی جا رہی ہوں، معصوم بچوں کو ذبح کیا جا رہا ہو تو مغلوب طبقے میں خوف و ہراس پیدا ہو جانا فطری بات ہے۔ کتنے ہی نو مولود بچے تک جان سے مار دیے جاتے ہیں، کتنے ہی زخمی ہوتے ہیں، معذور ہو جاتے ہیں

اور کہتے ہی اپنی دہشت زدہ ماؤں کی گود میں اندھیروں میں بچلتے گھروں کے بیچ سے انسانی درندوں سے بچتے بچاتے بے امان ہو جاتے ہیں۔ زخمی، معذور اور دہشت زدہ بچوں کو خوف کا جو تجربہ ہوتا ہے وہ ان کی شخصیات میں ان مٹا نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ بے ایمانی اور غیر محفوظ ہونے کا یہ خوف وہ لوگ پیدا کراتے ہیں جن میں خدا کا خوف نہیں ہوتا، جو اپنی کمرسیوں، عہدوں اور لوٹ مار کے مال کو اپنی کمائی سمجھتے ہیں، وہ کیا جانیں کہ وہ کتنے بڑے خسارے میں ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ چند روزہ زندگی کے لیے انہوں نے ظلم و ستم کے ذریعہ جو کچھ کمایا ہے اس کی وجہ سے وہ آئندہ نسلوں کے ذہنوں کو زہر آلود کر رہے ہیں۔ روز بہ روز ہمارے معاشرے میں جو وحشت و درندگی بڑھتی جا رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بچے کو طفولیت کے زمانے سے ہی بے رحمی، درندگی اور نفرت کے تجربے ہو رہے ہیں۔ مغلوب طبقے کے بچوں میں عموماً بے بسی اور بے چسپاںگی کا احساس پروان چڑھتا ہے کیوں کہ وہ ہر طرح غیر محفوظ ہوتے ہیں۔ ان بچوں میں سے اس خامی کو دور کرنا اور خود اعتمادی پیدا کرنا بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ کام تو ہمیں کرنا ہی ہے۔

آگ اور خون سے یاد دہشت و درندگی سے متاثر ہونے والے بچوں کا معاملہ تو اہم ہے ہی ان کے ساتھ ان بچوں کو بھی ذہنی طور پر متاثر ہونے سے بچانے کی ضرورت ہے جن کے گھروں میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور والدین سمجھے سمجھے سے رہنے لگتے ہیں۔

بچے جب ایسے حادثہ سے دوچار ہوتا ہے جس سے اس کے ماں باپ تک ہوش و خواس کھو بیٹھتے ہیں تو اس کے دماغ اور دل کو شدید جھٹکا لگتا ہے۔ یہ خوف کے تجربہ کا جھٹکا اس کی یادداشت میں پیوست ہو جاتا ہے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کم ہمت بنا دیتا ہے۔ اس خوف کے جھٹکے کو بالکل مٹایا تو نہیں جا سکتا لیکن بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ صبر و تحمل اور برداشت کے لیے بچے کو آمادہ کیا کیجیے۔ خیر اور شر کا فرق، خیر میں بھلائی اور شر میں شیطانی طور طریقوں، تباہ کاری، مومن کا اللہ پر بھروسہ اور اللہ

کے باغیوں کی درندگی میں فرق وغیرہ اس طرح واضح کیجیے کہ بچے میں اپنے آپ پر اعتماد کی صلاحیت پروان چڑھے۔ اُسے یہ بتائیے کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ کبھی بھی ناانسانی نہیں کرتا، البتہ شیطان اللہ کے بندوں کو ہر طرح آزمائش میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا وعدہ ہے:

”بے شک! جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیں اور وہ اللہ کی بندگی حسن و خوبی سے کرنے والے ہوں ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور (وہاں) انہیں کسی طرح کا خوف نہ ہوگا، نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے۔“ (البقرہ - ۱۱۲)

بچے کو سمجھائیے کہ خیر کے دشمن شیطان صفت انسان ہیں حق سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہم ان کی ظالمانہ حرکتوں اور درندگی کے عمل پر بول نہ سکیں، انہیں غلط نہ کہہ سکیں، ان کی بُرائی کو کھول کر بیان نہ کر سکیں۔ ہم جب اس ڈراوے کے باوجود حق سے چٹے رہتے ہیں تو وہ باطل اپنی ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لیے آگ، خون، قتل، غارتگری، تباہی، لوٹ مار، ہر طرح کی سزا دیتا ہے لیکن بچہ اس فلسفے کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ان حقیقتوں کو سمجھانے کے لیے اُسے دلاسا دینے، پناہ دینے اور ڈھارس بندھانے کی ضرورت ہوگی۔

بچہ ہر مصیبت کا مقابلہ بڑے عزم و حوصلے سے کرنے لگے گا اگر آپ اُس کے ذہن میں یہ اعتماد بٹھا دیں کہ: ”شیطان سے مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ہر طرح کی مشکل کا سامنا کرنا ہوگا، ہر تکلیف برداشت کرنی ہوگی تاکہ ہم بُرائیوں کو دور کر سکیں۔“ اس تربیت سے اس میں خوف بھی کم ہو جائے گا۔

## بچوں میں جھوٹ

اس بات سے تو آپ کو بھی اتفاق ہوگا کہ بچے جھوٹ بولنے کی عادت ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آتے، بلکہ اسی دنیا میں ہم آپ سے کسی نہ کسی طرح سیکھتے ہیں اور ہماری آپ کی بے توجہی کی وجہ سے اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بچوں کا یہ عمل ہمارے لیے کسی طرح پسندیدہ نہیں ہوتا اور اس کے لیے ہم انہیں اکثر سخت سزائیں دیتے ہیں مگر وہ

اس سے باز نہیں آتے۔ آخر ایسا کیوں ہے اور کیا اس عادت کو ہم اُن سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے؟ یہ باتیں غور طلب ضرور ہیں لیکن جب تک ہم یہ نہیں سمجھ لیتے کہ وہ جھوٹ کیوں بولتے ہیں، اس وقت تک ہم اُن کی اس بیماری کا علاج بھی نہیں کر سکتے۔ یہ میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ بچے جھوٹ ہم آپ ہی سے سیکھتے ہیں، اُن کے سامنے جھوٹ بولنے کا مظاہرہ کرنے والے ہم ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی طرح طرح سے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پڑوسن ہمارے یہاں سے کوئی چیز مانگنے آتی ہے۔ فرض کیجیے وہ قنبچی لینے آتی ہے۔ ہم کو یہ خطرہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو خراب کر دے گی۔ اب کیا کیا جائے؟ بچے سے قنبچی بستر کے نیچے چھپا دی اور کہہ دیا وہ تو فلاں بہن لے گئی ہیں۔ بچہ یہ تمام حرکات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور عجیب چکر میں پڑ جاتا ہے کہ آخر یہ کیا ماہر ہے کہ اس چیز کے ہوتے ہوئے بھی انکار کر دیا گیا، پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابا جان سے کوئی ملنے آتا ہے اور وہ بچے کے ذریعے ہی کہلا دیتے ہیں ”جاؤ کہہ دو“ گھر میں نہیں ہیں۔“ اب بچہ پھر حکمراں جاتا ہے کہ یہ کیا بات ہے لیکن ایسے موقعوں پر وہ دیکھتا ہے کہ دوسروں کو اس طرح کی باتوں کا پتہ نہیں ہو جاتا ہے اور چھپکارا مل جاتا ہے اس لیے وہ بھی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے کیوں کہ یہ بڑا سہل نسخہ ثابت ہوتا ہے۔

جھوٹ صرف ایسے ہی موقعوں پر نہیں بولا جاتا ہے بلکہ اکثر اس لیے بھی بول دیا جاتا ہے کہ سانس بہوں کسی کی معمولی سی بات پر زبردست جھڑپ ہو جاتی ہے۔ دونوں کے دلوں میں غبار بھرا ہوا ہے۔ ایک دوسری سے منہ پھلاتے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی گھر کا سرد دھرا داخل ہوتا ہے، ایک دوسرے کی طرف سے شکایات اور زیادتیوں کا تذکرہ ہونے لگتا ہے اور اس جذباتی بہاؤ میں اپنی بچت کے لیے بہت سی من گڑھت باتیں بھی ایک دوسرے کے سر تھوپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بچہ دیکھتا ہے کہ ہمارے بزرگ اپنے بچاؤ کے لیے کیسے تھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور ان میں سے کتنے تو بے حد کارگر بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ انہیں بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔

پھر جب اس سے بھی کام چلتا ہوا نظر نہیں آتا تو اکثر خواتین بدلہ لینے کے لیے جھوٹ

تراشنا بھی شروع کر دیتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اچار دانی ٹوٹی تو پتی سے بے لکین کہا یہ جائے گا کہ بہونے توڑ دی لیکن ہو تصور بہونے کیا نہیں ہے اُسے وہ کیوں اپنے سر مڑھے گی وہ تو پرح ہی بولے گی کہ پتی نے توڑی ہے۔ گھر کے دو چار لوگ بہو کو نکوڑنہانے کے لیے ایک طرف ہو گئے اور لیجیے بہو ہی ملزم گردانی گئی۔ بچہ دیکھتا ہے کہ جھوٹ اتنا کارآمد ہوتا ہے کہ بے خطا کو بھی خطا وار بنا دیتا ہے۔

یہ تو ایسے جھوٹ ہیں کہ جو خواتین طیش کے عالم میں بول جاتی ہیں، لیکن سب سے عبرت انگیز جھوٹ وہ ہے جو دل لگی اور مذاق کے طور پر بولا جاتا ہے۔ کوئی بہیلی باتوں میں مگن ہے۔ اس کا بچہ صحن میں کھیل رہا ہے۔ اب ذرا اس سے لطف لینے کے لیے ایک دم چیخ اٹھیں ”دیکھ بہن! تیرے بچے کو کیا ہوا؟“ اور وہ بے چاری گھبرا کر چونک پڑی۔ سب ایک دم کھلکھلا کر سنس پڑیں۔ وہ بے چاری شرمندہ ہو گئی بچہ دیکھتا ہے کہ یہ تو بڑا دل چسپ کھیل ہے اور جھوٹ سے ایک طرح کا لگاؤ سا محسوس کرنے لگتا ہے۔

غرض یہ کیسے بتایا جائے اور کہاں تک گنایا جائے کہ بچے کے سامنے جھوٹ کس کس طرح بولا جاتا ہے اور بچہ اُسے معمولی سی حرکت سمجھنے لگتا ہے اور جاوے جاہر موقعے پر اسے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی پڑھائی سے بچنے کے لیے، کبھی والدین کے غصے سے محفوظ رہنے کے لیے اور کبھی ساتھیوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارنے کے لیے۔

وہ جو یہ طرح طرح کے جھوٹ بولتا ہے ذرا اُن کو اس نقشے میں فٹ کر کے دیکھیے اُس نے کہاں تک بڑوں کی نقل کی ہے؟ آپ جتنا بھی غور کریں گی اتنا ہی ان کی سمجھ میں آتا جائے گا کہ اس کا اپنا اختیار کیا ہوا جھوٹ کم ہے، بڑوں کا عطا کردہ زیادہ ہے۔ میں نے ایک ایسا بچہ بھی دیکھا جس کے سامنے تمام مواقع پر جھوٹ بولنے سے پرہیز کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ سال کی عمر تک تو اس کو یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ جھوٹ کسے کہتے ہیں اور پھر کافی عرصے تک اس نے جھوٹ بولنا گوارا ہی نہیں کیا۔ (اس کے بعد سے میں واقف نہیں) ہم بے سمجھے بوجھے بچوں کو جو اس طرح جھوٹ بولنا سکھا دیتے ہیں۔ یہ کس قدر

تباہ کن ہے، شاید اس کا ہمیں اندازہ ہو۔ قرآن کریم میں جھوٹ بولنے والوں کو اکٹھا دوزخ کی سزا کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو فرمایا ہے کہ آخرت میں ان کی بخشش نہ ہوگی جو جھوٹ بولتا رہا ہے۔ اب سوچئے کہ کیا ہم خود کو اور اور اپنی اولاد کو اس سے بچانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ — اچھا! اگر ہم ان کو اس آگ سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی اس عادت کو ترک کریں جو ان کے بگاڑ کا سبب ہے۔ جھوٹ کے معاملے میں اگر آپ غور کریں گی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو سچا پائیں گی کہ جھوٹ ایمان کو متزلزل کر دیتا ہے۔ طرح طرح کی بڑائیوں کی جڑ ہی ہوتا ہے ایک جھوٹا اپنے کسی معاملے میں صاف نہیں ہوتا۔ وہ نہ معلوم کتنے ہی موقعوں پر اس تہرے کو استعمال کرتا ہے، اور جب کامیاب ہوتا ہے تو اور زیادہ دلیر ہو جاتا ہے اور بڑے بڑے جرائم پر اتر آتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا اس کے شر سے بھر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی سزا مقرر کی ہے تاکہ ایسی موذی بڑائی مومن کے دل میں راہ نہ پاسکے۔ لیکن آپ کا معاملہ تو بالکل دوسرا ہے۔ آپ کو تو ایک صاف سادہ اور معصوم ذہن کو اس زہر سے محفوظ رکھنا ہے اور اس کے لیے تدبیر کرنی ہے، وہ یہی ہے کہ ایسی محفلوں سے دور رکھیں، جہاں جھوٹ بولنا ایک معمولی سی بات ہے۔

لیکن بعض وقت بچے کے ساتھ زیادتی بھی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بدگمانی کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی اصلاح سے اٹا اثر لیتا ہے۔ مثلاً یہ کہ بچہ کوئی بات کہہ رہا ہے اور ہم اس کو راست گو بنانے کے لیے سوال کر بیٹھتے ہیں۔ ”جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟“ یا بعض وقت ہم یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ ”تم جھوٹے ہو؟“ اور یہ فقرے اتنے عام ہوتے ہیں کہ بچہ ان کو سننے سننے عادی ہو جاتا ہے اور اس فعل کی بڑائی اس کی نظر میں ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ سچ سچ جھوٹا بن جاتا ہے اور جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ بدگمانی آپ کو معلوم ہے انتہائی بڑا فعل ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی بدگمانی اس کو سدھارنے کے بجائے بگاڑنے لگتی ہے۔

اس لیے آپ اس بارے میں پوری احتیاط کریں کہ آپ بچے کی طرف سے خوش گمان ہوں، بدگمان نہ ہوں۔

بچوں کے ساتھ اکثر یہ لطیفہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بے چارے اپنی دانست میں سچ بول رہے ہوتے ہیں، لیکن ہوتا ہے وہ جھوٹ!

مثلاً آپ نے اسے دھوبی کو بلانے بھیجا، وہ دھوبی کے گھر گیا، لیکن دھوبی نہ ملا۔ اس نے آکر سچ بات بتادی لیکن آپ کو یقین نہ آیا۔ آپ نے کسی اور کو بھیجا وہ دھوبی کو بلالایا۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ دھوبی کے گھر گیا ہی نہیں ہے، بہانہ کر دیا ہے۔ آپ اس سے پھر پوچھتی ہیں، وہ کہتا ہے "میں گیا تھا" آپ اس سے جرح کرتی ہیں اور تصدیق کے لیے ادھر ادھر کے سوالات کرتی ہیں: "اچھا بتاؤ وہ اندھی فقیرن راستے میں بیٹھی تھی یا نہیں؟" بچہ اُسے روز لاتے میں دیکھتا تھا، اس لیے کہہ دیتا ہے "دیکھا تھا" حالاں کہ اس نے اس طرف غور نہیں کیا تھا۔ اب آپ تحقیق کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو وہاں تھی ہی نہیں۔ بچہ بے چارا جھوٹا بن جاتا ہے۔ وہ لاکھ اپنی صفائی پیش کرتا ہے لیکن چٹکارا نہیں بلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ موقع پر وہ سچ بول جھوٹ بول جاتا ہے۔

یا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ اُس سے اُس کے مدرسے کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتی ہیں اور وہ اپنے تصور میں پورا نقشہ کھینچ کر بیان کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن جوں کہ وہ بچہ ہے اس لیے بعض ایسی باتیں بھی وہ بیان کر جاتا ہے جن کو وہ کل بتا چکا تھا۔ اب آپ کو اس پر شک ہونے لگتا ہے کہ وہ کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔

آپ اس کا تجربہ کر سکتی ہیں۔ ایک الماری میں چائے کے برتن بجا کر رکھ دیجیے، لیکن پیالیوں میں چمچے نہ رکھیے۔ اب بچے کو بلا کر دکھلائیے اور دو ایک منٹ کے بعد الماری بند کر دیجیے۔ اس سے پوچھیے کہ الماری میں کیا رکھا ہے؟ جب وہ چیزوں کے بارے میں بتانے لگے تو آپ اس سے سوال کریں: "پیالیوں میں چمچے بھی رکھے ہوئے تھے؟" دیکھیے وہ جلدی سے ہاں کہہ دے گا، اگر اس نے چمچوں پر غور نہیں کیا ہے کیوں کہ اُسے یقین ہے کہ چائے کے برتنوں کے ساتھ چمچوں کا ہونا ضروری ہے۔ بس اسی طرح وہ ان مواقع پر بھی کرتا ہے۔

ہاں تو یہ ہیں وہ مواقع جب بچہ جھوٹ بولتا ہے اور ان حالات میں آپ اس کو کس طرح جھوٹ بولنے سے بچا سکتی ہیں؟ یہ بھی میں بیان کر چکا۔ شاید آپ نے غور کیا ہو کہ اس عادت کا



- مچھڑانا اور اس سے بچانا کتنا آسان ہے؟ یعنی :
- بچے کے سامنے جھوٹ نہ بولا جائے، بلکہ کبھی بھی نہ بولا جائے۔
  - بچے کی طرف سے بدگمان ہونے کے بجائے خوش گمان رہا جائے۔
  - بچے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے اس سے جرح نہ کی جائے۔

## چند لفظوں میں

- بچے میں تو انانی کی بہتات اُسے ایسے افعال کرنے پر آمادہ کرتی ہے جن کو آپ شرارت گردانتی ہیں۔ شرارت سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

## بچہ اور سزا

- بچہ اپنی عزت اور اپنا وقار رکھتا ہے۔ آپ کی سزا سے وہ دوسروں کے سامنے رُسوا ہونا پسند نہیں کرتا۔ سزا دے کر اُسے بغاوت پر نہ اُکسائیے۔
- بے جا سزا پر بچہ اپنی بڑی حرکت سے نہیں، آپ سے نفرت کرنے لگے گا۔ اس لیے آپ کی سزا اصلاح کے لیے ہی ہونی چاہیے۔
- محض سزا کی دھمکی سے بچہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے، اس لیے جب آپ نے تنبیہ کی ہے تو اپنے الفاظ کو جھوٹا نہ ثابت کیجیے۔
- بچہ ہر شرارت جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا اگر ایسے موقعے پر آپ اسے سزا دیں۔
- معمولی بات پر بڑی سزا بگاڑ کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ زیادہ عوزوں طریقہ بچے میں غلطی کا احساس پیدا کر دینا ہے۔
- اگر بچے کو غلطی کا احساس ہو جائے تو معاف کر دینا زیادہ موثر ثابت ہوگا۔
- یہی وہ موقع ہے جب آپ اُسے خدا کے خوف سے بھی آگاہ کر سکتی ہیں۔
- اگر شرارت پر سزا کا مقدمہ آپ نے باپ یا کسی بزرگ کے سامنے پیش کر دیا ہے تو اب

بے وجہ اپنی مامتا جتا کر بچے کی نظر میں باپ یا دوسرے بزرگ کو ظالم ثابت نہ کر لیتے۔

### بچوں کی ضد

- بچے کو اگر کسی مشغولیت سے باز رکھیں تو اس کی وجہ بھی بتادیں ورنہ اس کا ذہن الجھن میں گرفتار ہو جائے گا۔
- بچہ ضد اسی وقت کرتا ہے جب وہ کسی بات کو صحیح سمجھتا ہے اور اس پر جبار ہوتا ہے۔
- آپ اس کی ضد ختم کرنے کے لیے اس بات کی خرابی اُسے سمجھا دیں۔
- ضد بھی دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ کہیں آپ کے بچے کے ساتھ یہ معاملہ تو نہیں؟
- اگر ضد بیماری یا کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے تو اس کا علاج کیجیے۔
- ضدیں پیارا اور شفقت سے جس قدر آسانی سے دور کی جاتی ہیں اتنی آسانی سے شاید کسی اور طرح دور نہ کی جاسکیں۔
- اگر بچے کو اپنی ضد سے دوسروں کی تکلیف کا احساس ہو جائے تو وہ اپنی ضدیں کم کرنے کی طرف مائل ہو جائے گا۔

### بچوں میں غصہ

- اپنے لطف کے لیے بچے کو چھیڑ چھیڑ کر ناراض نہ کیجیے۔
- گھر والوں کی تند مزاجی میں کسی بچے میں بھی غصے کو کم کر دے گی۔
- غصے کو خاندانی فخر بنا کر بچے کے سامنے نہ پیش کیجیے اور نہ وہ اُسے اپنی خوبی قرار دے لے گا۔
- اگر بچہ اپنی بات سمجھانے میں ناکام ہوتا ہے اور جھنجھلا اٹھتا ہے تو یہ آپ کا فرض ہے کہ خود تحمل سے کام لیں۔
- بیماری کے زمانے میں بچہ اپنی تکلیف کی وجہ سے محبت کا زیادہ خواہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اکثر اپنی

ناگواری کا اظہار کرتا ہے، اسے گوارا کیجیے۔  
○ غصے کی حالت میں بچے کی توجہ کسی دل چسپ مشغلے کی طرف موڑ دیجیے۔ غصہ ختم ہو جائے گا۔

### بچوں میں خوف

○ بچے پیدا آنشی طور پر کسی چیز سے خوف نہیں کھاتا۔ اسے وہ آئندہ زندگی میں آپ لوگوں سے سیکھتا ہے۔ اُن سے خوف کھاتا ہے۔

○ بچے جن چیزوں سے واقف نہیں ہوتا یا جن کو وہ اپنی قوت سے بالاتر سمجھتا ہے اُن سے خوف کھاتا ہے۔

○ آپ بچے کے سامنے خوف کا مظاہرہ کریں گی تو بچے خوف کھانا سیکھ جائے گا۔

○ بچے کو وہی، فرضی اور خیالی واقعات سنائیں گی تو بچے خوف زدہ رہنے لگے گا۔

○ بلاوجہ جھڑکنا، ڈانٹنا اور ناراض رہنا بھی بچے کے اندر خوف بٹھا دیتا ہے۔

○ آجکل کے فسادات اور قتل و غارت گری کے ذریعہ بچوں میں جو خوف پیدا ہو جاتا ہے اس سے بچے کو محفوظ نہیں رکھا جاسکتا۔

○ بچے کو طفولیت ہی میں بے رحمی، درندگی اور نفرت کے تجربے ہو رہے ہیں۔

○ بچوں میں سے اس خوف کو دور کرنا اور خود اعتمادی پیدا کرنا بڑا صبر آزمایا کام ہوتا ہے۔

○ جب بچے کے والدین بیوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں تو اُس کے دماغ اور دل کو شدید جھٹکا لگتا ہے جو ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

○ اس جھٹکے کو مٹایا تو نہیں جاسکتا لیکن بڑی حد تک کم کیا جاسکتا ہے۔

○ خیر و شر کا فرق اور حق و باطل اُن حالات میں پیش آنے والے حادثات و سانحات سے سمجھائیے۔

○ اشرار کے نسل کشی کے شیطانی حملوں کے دوران بچے کو دلاسا دینے، پناہ دینے اور ڈھارس بندھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

○ بچے میں ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کا عزم و حوصلہ پیدا کیجیے۔ اس تربیت سے اس میں خوف بھی کم ہو جائے گا۔

### بچوں میں جھوٹ

- آپ کی بے توجہی سے بچہ جھوٹ کا عادی ہو جائے گا۔
- بچے کے سامنے آپ جھوٹ بولیں گی تو بچہ بھی جھوٹ بولنے لگے گا۔
- اگر اپنے بچاؤ کے لیے یاد دوسروں سے انتقام لینے کے لیے آپ جھوٹ بولتی ہیں تو بچہ بھی اسے بہترین حربے کے طور پر استعمال کرے گا۔
- مذاق میں بھی بچے کی طرف سے بدگمانی نہ کریں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔
- ہر معاملے میں بچے کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش نہ کریں۔
- بچے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے اس سے چرج نہ کریں۔ خوش گمانی سے بھی کام لیا کریں۔

## بچوں کی اہمیتیں

ایک بہن نے اپنے بچے کی تربیت کے لیے اپنی امکانی کوشش کرنی چاہی لیکن ہر جگہ ہر قدم پر ہر معاملے میں اُن کے خاوند کی طرف سے رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ رُکاوٹ سے یہ مطلب نہیں کہ اُن کے خاوند اپنے بچے کی بہتر تربیت نہیں چاہتے تھے، بلکہ وہ اس طرف کسی قسم کی توجہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ شاید اُن کا خیال ہو کہ بچوں کو جنگلی پیٹر پودوں کی طرح پرورش پانے اور بڑھنے دینا چاہیے۔ جس طرح ایک پودا پیڑ بننے کے بعد اپنے فرائض انجام دینے لگتا ہے اسی طرح بچہ بھی بڑا ہو کر اپنے فرائض انجام دینے لگے گا۔ نہ معلوم انسان کو حیوانوں اور پیٹر پودوں کی صفت میں شمار کرنا کہاں تک درست ہے؟ لیکن پھر بھی کچھ والدین ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ ذرا بھی اس کی فکر نہیں کرتے کہ ان کا بچوں کے سامنے بے پروائی سے غیر محتاط طور پر ہر فعل و عمل کرتے رہنا درست نہیں ہوتا اور یہ چیز بچوں کے لیے کس قدر مُصنر ہوتی ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے بچوں کی تربیت سنجیدگی کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا اُن خاتون سے پوچھیے جن کے خاوند نے تربیت کی ساری ذمے داری اُن کے کندھوں پر ڈال دی اور خود کو بالکل بُری الذمہ سمجھ بیٹھے۔ اُن کا دوستوں کے درمیان بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا، تاش کھیلنا اور سگریٹ پان وغیرہ سے بے تکلفی کے ساتھ لطف اندوز ہونا اور بچے کے سامنے ایسا نمونہ پیش کرنا کہ وہ ایک لالہ بانی زندگی کو نصب العین بنالے، بچے کے لیے زندگی کا یہ نمونہ کہاں تک مفید ہو سکتا ہے؟ انھیں اس کی پروا ہی کب ہوگی کہ انھیں بچے کو کیا دینا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے :

”باپ کی طرف سے اولاد کے لیے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں کہ وہ ان

کی اچھی تربیت کرے۔“

مگر کیا واقعی وہ بچے کو اس قیمتی عطیے سے مالا مال کر رہے ہیں؟ شاید نہیں! —

اور صرف ایک یہی حضرت نہیں، بلکہ ایسے تمام والدین جن کی نظر میں تربیت کی کوئی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہوتی، اپنے بچوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں۔

## کچر و والدین

بچہ اسی طرح زندگی گزارے گا جس طرح دوسرے گھروالے گزارتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک سفید کپڑا زرد رنگ میں ڈبو یا جائے اور جب باہر نکالا جائے تو وہ دھانی رنگ کا ہو؟ بالکل ایسے ہی غیر ذمے دارانہ ماحول میں رہ کر بچہ غیر ذمے داری کی زندگی گزارنا سیکھے گا، بلکہ زندگی کے بہت سے معاملات میں خود اسے اپنے ہی تجربات کا سہارا لینا پڑے گا۔ اُسے خود اپنی عادات و اطوار اور اخلاق و سیرت کو ڈھالنا پڑے گا اور وہ خود اپنے اخلاق و سیرت کو کیا بنا سکے گا؟ بہت آسانی کے ساتھ قیاس کیا جاسکتا ہے۔

بچوں میں آوارگی و والدین کی اُن کی طرف سے بے پروائی تمام کاموں میں غیر سنجیدگی اور زندگی کی جدوجہد میں غیر ذمے داری اور بے توجہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور خاص طور سے اسلامی زندگی کے تقاضے تو ایسے بچے بڑے ہو کر پورے کر ہی نہیں پاتے ہیں۔ اس لیے ایسے والدین کو چاہیے کہ اپنی کجروی کو بچوں کی کجروی سے پہلے درست کر لیں اور پھر اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ اس کی فکر کریں کہ اُن کا بچہ اُن کی ہی طرح شروع ہی سے بہکنے نہ لگ جائے۔ دوسری قسم کے کچر و والدین وہ ہیں جو ایسے والدین کے مقابلے میں بالکل ہی دوسرا رویہ اختیار کرتے ہیں وہ بچوں پر بے انتہا پابندیاں عائد کر دیتے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ پابندیاں عائد کر دیں بلکہ اپنی بات منوانے کے لیے اور اپنا کہا کرانے کے لیے بہت ہی درشت ہجہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے کتنے ہی ایسے بزرگوں کو دیکھا ہے جن کے سامنے بچے جاتے ہوئے

اس طرح گھبراتے ہیں جیسے بلی کے سامنے چوہا۔ وہ جب بھی بچوں سے کچھ کہتے ہیں تو بھوپیں ترچھی کر کے، آنکھیں سُرخ کر کے اور چہرہ کسی قدر بھیانک بنا کر۔ آپ جانتی ہوں گی کہ ایسے سرپرستوں کا بچے پر کیا اثر ہوتا ہوگا؟

بچے اُن کی صورت سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے غصے اور مار کے خوف سے وہ خواہ ان کے کام تو کر دیں لیکن اُن سے بغاوت کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ نے یہ مثل تو ضرور سنی ہوگی: ”ولی کے گھر شیطان“۔ جی ہاں!۔ یہ مثل ایسی موقعے پر صادق آتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ایسے والدین کا رویہ ہی بچوں کو اکساتا ہے کہ وہ جو کچھ کریں وہ بڑوں کے عمل کے بالکل خلاف ہو۔ کیوں کہ جب اُن کی نگاہ میں اُن کے بڑے ہی پسندیدہ نہیں ہیں تو پھر ان کے اعمال اُن کے لیے پسندیدہ کیوں ہوں؟

ایسے والدین خواہ کتنا ہی کہیں کہ وہ یہ سختی اپنے بچوں کو سدھارنے کے لیے کر رہے ہیں لیکن پھر بھی ان کی بات ماننے کے لائق نہیں۔ غضب اور غصے سے بھرا ہوا دل کبھی بھی محبت اور شفقت کے لیے جگہ خالی نہیں کر سکتا۔ پھر جب برابر سختی کا بُرا تاؤ بچوں پر کیا جائے اور صرف ان کی خامیوں ہی پر نظر رکھی جائے تو اپنا مزاج بھی عیب چین بن جاتا ہے۔ بچوں کے ہر عمل و فعل میں خامی نظر آنے لگتی ہے اور ان کو ہر قدم پر ٹوکنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ پھر جب بچے حکم عدولی کرتے ہیں تو بچوں کے خلاف جذبات اپنے اندر اُبھرنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ بچوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اس حد پر پہنچ کر پھر بچوں کی اصلاح نہیں ہو پاتی، بلکہ اُن سے بغض ضرور ہو جاتا ہے اور جب بچے اپنے ساتھ یہ رویہ دیکھتے ہیں تو وہ بھی سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف کج رویاں بڑھتی جاتی ہیں اور حالات قطعاً ناخوش گوار ہو جاتے ہیں۔

پھر کیا ایسے والدین کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنی شقی القلبی سے باز آجائیں اور بچوں کے ساتھ نرم روی اور صالحیت کے ساتھ پیش آئیں۔

ایک اور طرح کے کج روی والدین وہ ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کے ساتھ بے انتہا محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اُن کی ہر نازیبا حرکت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ صاحب آپ تو لاڈ پیار میں اپنے بچوں کو خراب کیے دیتے ہیں تو وہ

کہتے ہیں بچوں سے محبت نہ کریں تو کیا کریں؟ کیا ان کو زندہ دفن کر دیں؟ حالات کہ جس طرح کی محبت وہ کر رہے ہیں وہ ہے ہی ان کو زندہ دفن کرنے والی۔ اس سے پہلے بھی میں آپ کو یہ بتلا چکا ہوں کہ لاڈ پیار سے بچے میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہی کہ وہ اپنی ہر اچھی بڑی خواہش کو پورا کر لینا ہی ضروری سمجھتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ والدین اس کے لیے ہر صورت میں تیار ہوں گے۔ چنانچہ وہ انتہائی عیش و عشرت کی زندگی کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا ہر مطالبہ اس کے والدین کسی نہ کسی طرح پورا کریں گے ہی خواہ قرض لے کر کریں یا اپنا مال و متاع بیچ کر یا پھر لاڈ پیار تو بچے میں اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کی قوت ہی زائل کر دیتا ہے، اس لیے وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے سامنے نہ دوسروں کی پریشانیوں کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ اپنے تقاضوں کے سامنے کسی طرح کے کسی عذر کو معقول سمجھتا ہے۔ ویسے بھی وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ تکلیف اور سزا کیا چیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی والدین کی حد سے بڑھی ہوئی خدمت گزاری اُس کے اندر سے خود اعتمادی کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کر پاتا۔ ہر قدم پر والدین کی اور اُن کی غیر موجودگی میں دوسروں کی رہنمائی اور امداد کا ٹوگر رہتا ہے۔ اپنے آپ نہ کوئی فیصلہ کر پاتا ہے اور نہ کسی کام کو انجام دے پاتا ہے۔ بس ایک بے عقل حیوان ہوتا ہے۔ وہ جو کسی غیر کے اشاروں پر سب کچھ کرتا ہے، اور یہ چیز اس کی آئندہ زندگی کے لیے انتہائی عبرت انگیز ہوتی ہے جب خود اس کے کندھوں پر ذمے داریاں پڑتی ہیں اور دوسرے اُس کے دست نگر ہونے میں جب خود اس کے سامنے زندگی کی مشکلات بے نقاب ہو کر آتی ہیں اور خود اس کو اپنے فیصلے سے نمٹنا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اس کا ذہن پریشان اور پراگندہ ہو جاتا ہے اور بسا اوقات وہ خودکشی کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے ورنہ ایک درد انگیز اور پریشان حال زندگی گزارتا ہے۔

اب آپ خود اندازہ کیجیے کہ یہ وہ عطیہ تو نہیں جس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ یہ وہ بخت نہیں ہے جس کے ذریعے آپ اس کی زندگی کو خوش گوار بنانا چاہتی تھیں۔ نہیں ایسے والدین تو محبت کرنا ہی نہیں جانتے وہ تو محض جذبات کی تسکین کے لیے اندتے ہو جاتے ہیں۔ جذبات کی تسکین کے لیے اندھے ہو جانا؟۔ جی ہاں حقیقت یہی ہے۔



بچوں سے بے انتہا محبت تو وہی کرتے ہیں جن کو اپنے ارمانوں اور تمناؤں کے نکالنے کا شوق ہوتا ہے۔ "میرے تو ارمان ہیں کہ اپنے بچے کی شادی اس دھوم سے کروں کہ زمانہ یاد رکھے۔" "میری تو یہی تمنا ہے کہ میرے جیتے جی میرے بچے کے کانٹا تک نہ چھبے۔ ایسی ہی اور نہ معلوم کتنی تمنائیں اور ارمان ہیں جو اپنے نفس کو تسکین دینے کے لیے پورے کیے جاتے ہیں۔ کیا بچے کے لیے اس طرح کے تصورات غیر اسلامی نہیں ہیں؟ کیا یہ ارمان کسی طرح بچے کی زندگی میں ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والی خوشیاں فراہم کر سکیں گے؟ اور پھر کیا ان کی بدولت بچہ ایک اور بڑی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائے گا؟ لیکن والدین کو اس کی کیا پروا۔ وہ تو بس اپنی زندگی ہی تک سب کچھ محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد بچے کا کیا حشر ہوگا؟ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے تو نہ آئیں گے۔ پھر یہ لاڈ پیار، والدین کی کج روی نہ ہونی تو کیا ہونی؟ ان کی ہمدردیاں بچے کے ساتھ نہیں بلکہ ان کی دلچسپیاں صرف اپنے ارمان نکالنے میں ہیں۔

کچھ والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو بچوں کو وقت سے پہلے ہی بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ان سے اس طرح پیش آتے ہیں کہ جیسے وہ کسی سن رسیدہ شخص سے ہمکلام ہوں۔ ایک ترمیمی درس گاہ کے ایک اتالیق صاحب ایک آٹھ سال کے بچے سے اس طرح مخاطب ہوئے:

"میں دو تین دن سے دیکھ رہا ہوں! برابر تم بد تمیزی سے پیش آتے ہو! اب آئندہ اگر میں نے تم کو زبان لڑاتے دیکھا تو اچھا نہ ہوگا تمہارے لیے۔"

اب آپ خود ہی غور کیجیے کہ یہ فصیح و بلیغ تقریر اس بچے کے لیے کہاں تک مناسب ہوگی اور وہ اس سے کیا حاصل کر سکے گا؟ وہ تو بس یہی خیال کرے گا کہ ہمارے بزرگ ہماری کسی بات پر ناراض ہو گئے لیکن وہ کون سی بات ہے؟ بچہ شاید یہ سمجھ ہی نہ سکا ہو۔ کئی ایک گھڑیوں میں میں نے خود دیکھا ہے کہ تین چار سال کے بچوں اور بچیوں سے اس طرح ڈکھڑا رویا جاتا ہے جیسے وہ بوڑھے پاکھٹ ہوں۔ مثلاً ایک ماں اپنی تین چار سال کی بچی سے کہنے لگی:

"خدا تجھے سمجھے۔ ابھی جب تیرے لٹچپن ہیں تو بڑی ہو کر تو کیا کرے گی۔"

یا ایک محترمہ اپنے بچوں کے سامنے اس طرح فریاد کرنے لگیں:

”تم لوگوں نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کب مروں گی، کب نجات ملے گی، تمہارے پیچھے اپنی زندگی کھپاؤں اور تم لوگ ہو کہ مرتے دم میری حلق میں ایک قطرہ پانی بھی نہ ٹپکاؤ گے“ یہاں یہ بات بھی بتلا دوں کہ یہ بچے سات آٹھ سال سے زیادہ عمر کے نہ تھے۔ خیر یہ تو درست ہے کہ جب اپنے پر قابو نہیں رہتا تو آدمی سب کچھ کہہ جاتا ہے، لیکن غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ جس کے سامنے یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے وہ اس قابل بھی ہے کہ یہ سب کچھ سمجھ سکے؟

یہ برتاؤ صرف گفتگو ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ تمام معاملات میں روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً: کھیل کود میں بچے کی قمیص پھٹ گئی اور اماں جان لے کر بیٹھ گئیں اپنی راگ مالا: ”کس قدر بد سلیقہ ہے تو، نہ پکڑوں کی پروا، نہ ماں باپ کے دکھوں کی، کہاں سے آئے گا تارون کا خزانہ جو روز ایک نیا شاہی جوڑا بنا کرے گا؟“

یاجب کوئی ہدایت دینے کا موقع آتا ہے تب بھی یہی رویہ رکھا جاتا ہے: ”دیکھ قرینے سے اٹھانا پیالی۔ ارے کہیں ایسے بھی لے کر چلتے ہیں پینی کے برتن کو؟“

”تجھ کو اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں، آخر کس مصروف میں آئے گا تو بڑا ہو کر۔ کچھ کام بھی تو کیا کر۔“

”بڑھکے تار کا تار تو ہو گیا لیکن عقل ذرا بھی نہ آتی۔ جگ ہنسائی کرائے گا تو اور کیا کرے گا؟“

حالاں کہ وہ بے چارہ بڑھکے تار کر کا بیڑا اتنا تو کیا چار فٹ کا بھی نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی اس میں تیس چالیس سال کے بڑوں کی سی عقل آئی ہے لیکن ماں باپ کچھ ایسا ہی سمجھنے پر مصر ہو گئے ہیں۔ اب کیا یہ روش بچے کو غیر مطمئن نہ کر دے گی؟ کیا وہ یہ نہ سوچنے لگے گا کہ کتنی کمیاں ہیں مجھ میں! نہ عقل ہے، نہ سمجھ، نہ سلیقہ! میں تو واقعی ایک دم ناکارہ ہوں اور یہ احساس اُس کو خود اپنی نظر میں بے وقعت بنا دیتا ہے۔ چناں چہ وہ ہر کام آگے بڑھ کر خود کرنے کے بجائے ہر موقع پر جھجک محسوس کرتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ کوئی دوسرا پیش قدمی کرے اور میں اس کی تقلید کروں۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں پیچھے رہتا ہے اور ایک طرح کا خوف دل میں بٹھائے رکھتا ہے جو اسے بزدل بنا دیتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ وہ اپنے کو ناقابل اصلاح سمجھ بیٹھتا ہے اور بجائے سدھار کی طرف

بڑھنے کے کج روی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر والدین کے طور طریقوں سے ہٹ کر بے راہ روی اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح کے والدین میں وہ بھی شریک ہیں جو اپنے بچوں کو خود بخود سرکش بنا دیتے ہیں۔ اکثر گھرانوں میں آپ نے خود بھی دیکھا ہو گا کہ چند بڑے بوڑھے بیٹھے ہیں۔ اتفاقاً ان کے درمیان بچہ بھی آجاتا ہے اور اس کے ماں باپ میں سے کوئی اُس کے بارے میں اپنے ہم عمروں میں سے کسی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

”آپ کی مستقلاً عادت ہے کہ ہماری ہر بات کے خلاف ہی کریں جو ہم کہیں اس کے بالکل برخلاف کریں۔ بس سرکشی تو جیسے انھوں نے ہمارے ہی لیے مخصوص کر رکھی ہے۔“

اب سوچئے کہ بھلا ایک بچہ ان طنزیہ جملوں سے کیا نصیحت حاصل کر سکتا ہے؟ علاوہ اس کے کہ وہ والدین کو اپنا حریف سمجھ لے۔ حالانکہ جیسا میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اس عمر میں تو بچہ اطاعت اور فرماں برداری کے لیے تیار ہوتا ہے۔ وہ ہر بات میں اپنے بزرگوں کی نقل کرنے میں لطف محسوس کرتا ہے لیکن یہ ایسے والدین ہیں کہ جو اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اطاعت و فرماں برداری اور تقلید کے لیے کسی اور کوتلاش کرے اور شوخی اور سرکشی کے لیے ان کو مخصوص کر لے۔

بہر حال اگر اس طرح بچوں کو وقت سے پہلے یہ احساس دلایا گیا کہ والدین کا ان پر کوئی زور نہیں رہا ہے اور وہ اُس کے سامنے مجبور و بے بس ہو گئے ہیں تو پھر وہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے گا اور اُسے جو کچھ سیکھنا ہے وہ والدین سے سیکھنے کے بجائے اپنے ان دوستوں سے سیکھے گا جو اُس کے ہم نوا ہوں۔

## دوسرا بچہ بحیثیت شریک

والدین کی بے اعتنائی بچے کی طرف سے اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، جب گھر میں ایک اور بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے۔ ان کی توجہ، محبت اور ہمدردیاں بڑی حد تک سمٹ کر آنے والے بچے پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور پہلے بچے کا مقام کچھ گر جاتا ہے۔

گھر والوں کی توجہ کامرز نو مو نو د بچہ بن جاتا ہے۔ سب اس کو ہی گود لے رہے ہیں، چوم رہے ہیں، تھپتھپا رہے ہیں، گد گدا رہے ہیں، بہلا رہے ہیں، اس کے رونے پر سب ہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اگر وہ بیٹاب کر دیتا ہے تو تقریباً سب ہی کپڑے بدلنے کو پہنچ جلتے ہیں۔ اس کی صحت اور دیکھ بھال کے لیے سب ہی متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن پہلا بچہ ہے کہ اب اگر وہ کسی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے تو کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے تو لوگ جی پڑا جاتے ہیں، اُسے ٹال دیتے ہیں۔ اس کو اگر کوئی ضرورت ہوتی ہے تو جلد اس کو پورا کر لے کی فکر نہیں کی جاتی۔ ”ذرا صبر کرو متا دودھ پی لے تو تم کو بھی دوں“ اور پھر خاص طور سے اس وقت جب وہ مٹے سے کھیل کر دل بہلانا چاہتا ہے، جیسے ہی وہ اس کے پاس پہنچا اور امی جان ایک دم تھخ اٹھیں۔ ”ہائیں، اس کے پاس مت جا، کیا مار ڈالے گا اے؟“ بس یہ چیز اس کے دماغ میں اور بھی کجی پیدا کر دیتی ہے۔ اُس کے دل میں بے سوچے سمجھے مٹا کی طرف سے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اُسے اچھی نگاہ سے دیکھنا ترک کر دیتا ہے۔

ویسے بھی وہ ایک اُلجھن میں پڑ جاتا ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ کل تک تو لوگ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے، میری ہر طلب پر فوراً متوجہ ہو جاتے تھے، میری خوشی کا پورا خیال رکھتے تھے اور میرے دل بہلاوے کا پورا پورا انتظام کرتے تھے اور ایک دم اس بچے کے آجانے سے سب نے مجھے نظر انداز کر دیا ہے، سب میری طرف سے غافل ہو گئے ہیں، سب نے میری ضرورتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ اب اس بچے کے ہوا کسی اور کا وجود اُن کے لیے کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا۔ اس بچے نے تو جیسے میرے تمام ہی حقوق پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ بہت بُرا ہے، یہ میری محبت کا مستحق نہیں یہ میرا دشمن ہے۔

اب وہ بچے کو زک پہنچانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اکثر وہ ماں سے کہتا رہتا ہے ”امی اس کو فقیرنی گودے دو، یہ بُرا ہے۔“ امی! اسے کھڑکی کے باہر پھینک دو۔ یہ روتا ہے، یا پھر اسی طرح کے اور دوسرے جملے! اس طرح کے جملوں سے اس کی ناپسندیدگی کا اظہار کتنے نمایاں طور پر ہو رہا ہے۔ وہ اس کو کس طرح اپنی اس ماں سے الگ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ اب تک بلا شرکتِ غیرے اپنی ماں سمجھتا رہا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ اپنی بیزاری کا اعلان کرے اور بچے کو ناپسند کرے، بلکہ جب کبھی وہ بچے کے پاس پہنچتا ہے تو کبھی اس کا ہاتھ مروٹا ڈالتا ہے، کبھی اس کے ٹھکی لے لیتا ہے، کبھی کسی اور طرح چھیڑ دیتا ہے۔ اور جب وہ دونوں چلنے پھرنے کی عمر کے ہو جاتے ہیں اور بات چیت کرنے لگ جاتے ہیں تو بڑا بچہ ہمیشہ چھوٹے بچے کو ڈبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو محض چھیڑنے کے لیے اکیلا چھوڑتا ہے اور چھوٹا بچہ روتا رہتا ہے۔

ایسا برتاؤ وہ ہر معاملے میں ہی روا رکھتا ہے۔

لیکن وہ اتنا ہی کافی نہیں سمجھتا ہے۔ وہ ماں اور دوسرے عزیزوں کی توجہ میں سے بھی اپنا حصہ حاصل کر لینے کی فکر کرتا ہے۔ پہلے پہل تو وہ سیدھے سادے انداز میں اس کا اظہار کرتا ہے کہ اس کا بھی خیال رکھا جائے۔ اس مطالبے کے لیے وہ کبھی رو کر کہتا ہے۔ ”امی بھوک لگی ہے!“ ”ہم سوئیں گے، نیند آرہی ہے!“ ”امی! ہم دودھ پیئیں گے!“ لیکن امی کے دماغ میں تو غیبر ارادی طور پر یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اب یہ ناز برداریوں کا مستحق نہیں رہا۔ اتنا بڑا ہو کر بھی یہ اس برتاؤ کا تقاضا کیسے کر سکتا ہے جو اب اس نو مولود کو زیب دیتا ہے، چنانچہ وہ اسے بہلانے کے بجائے اس کی ضرورتوں کو بے توجہی کے ساتھ پوری کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب پہلا سا برتاؤ نہ ہونے پر وہ اس کا خواہشمند ہوتا ہے۔ بچپن میں ایک بچے کو اس کی ماں لوریاں سنا کر سلا یا کرتی تھی لیکن جب تین چار سال کے بعد ان کے یہاں ایک اور بچہ آ گیا تو اب وہ بچہ نہ صرف ماں کے پاس سونے سے محروم ہو گیا بلکہ اس کو سوتے وقت لوریاں بھی نصیب نہ ہوئیں۔ وہ روزیہ چاہتا تھا کہ اُسے کوئی لوریاں سنا کر سلائے لیکن اس کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ چنانچہ پچ جاوے کہ وہ سن شور تک پہنچنے کے بعد بھی اس بات کا خواہش مند رہا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ دے اور وہ اسے کم از کم ایک بار لوریاں سنا کر سلا دے۔ غور کیجیے اس حسرت اور خواہش پر!

لیکن جب بچے کی خواہش پوری نہیں ہوتی اور وہ حسرت بن جاتی ہے تو وہ اپنی خواہشوں کا اظہار بالکل مختلف طریقے سے کرتا ہے اور ماں سے نزدیکی اور اس کی توجہ کو بالکل دوسرے طریقے سے حاصل کرتا ہے۔ مثلاً اُسے معمولی سا بخار آ جاتا ہے تو وہ بن کر لیٹ جاتا ہے اور اس بات کا اظہار

کرتا ہے کہ جیسے وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔ اب ماں توجہ کے لیے مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی تیمارداری پوری مستعدی سے کرتی ہے اور ادھر بچے کو اتنے عرصے کے لیے ماں کی محبت نصیب ہو جاتی ہے۔

وہ بات بات پر رویا کرتا ہے، کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو ماں کو یہ اطمینان رہے گا کہ بچہ بہلا ہوا ہے اور اس (ماں) کو اس (بچے) کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے اور اس عرصے میں وہ مننے کی ضروریات سے ہی نمٹ لے۔

وہ ضدیں کرنے لگتا ہے تاکہ اُس کی ضرورتیں ہی پوری کی جائیں اور اگر ماں اسے مارتی ہے تو یہ بھی کیا بُرا ہے؟ کم از کم وہ اس کی طرف متوجہ تو ہوتی ہے، اتنے عرصے کے لیے وہ مننے کے پاس سے ہٹ آتی ہے۔ کیا یہ اتنا کافی نہیں؟

وہ ماں کی ہدایتوں، تاکیدوں اور تنبیہوں کے باوجود مٹی میں کھیلتا ہے، کپڑے خراب کرتا ہے، دھوپ میں مارا مارا پھرتا ہے اور ایسے ہی وہ دوسرے کام کرتا ہے جن سے ماں اس کو منع کرتی ہے۔ پھر جب واپس آتا ہے تو ماں اُس کو مارتی ہے، اس کے کپڑے بدلتی ہے، اس کے ہاتھ منھ دھوتی ہے، کنکھا وغیرہ کرتی ہے، بنا سنوار دیتی ہے اور پھر وہ جلد ہی اپنی شکل بگاڑ لیتا ہے۔ گرد دھول اور مٹی میں اٹ جاتا ہے کیوں کہ جتنی دیر ماں اس کے کپڑے بدلے گی، اُس کے ہاتھ منھ دھلائے گی اور سنوارے گی اتنے عرصے وہ مننے سے دُور رہے گی اور وہ ماں کا قُرب حاصل کرتا رہے گا۔

غرض حسد کا جذبہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بالغ ہو کر بھائی بھائی کے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ — محض والدین کی بے خیالی کی وجہ سے!

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جس قدر محبت انھوں نے بچے کے لیے وقف کر دی ہے۔ اتنی محبت کا حق دار اُسے ہمیشہ ہی رہنا چاہیے۔ اس کے حصے کی محبت میں کمی نہ کی جاتے۔ ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ اگر اُسے آپ لوریاں سنا کر سلاتی تھیں تو اب بھی سونے سے پہلے اس کو لوری سنا دیں تاکہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ سوتے اور اگر پہلے اس کو اپنے ہاتھ سے کھلاتی تھیں تو اب بھی اتنا وقت نکالیں

کہ اس کی خواہش کو پوری کر دیں۔

مگر اس سے بڑھ کر سب سے زیادہ جس بات کا خیال رکھیں وہ یہ ہے کہ آنے والے بچے کے لیے پہلے بچے کے دل میں پہلے سے ہمدردی، محبت اور دل چسپی پیدا کر دیں۔ اسے پہلے سے ہموار کر لیں۔ مثلاً اُسے کچھ غرضہ پہلے معلوم ہونا چاہیے۔ (خواہ آپ کے منہ سے نہ سہی) کہ اس کے گھر میں ایک ننھا مٹا کھلونا آنے والا ہے جو بولتا بھی ہوگا، ہنستا بھی ہوگا، دیکھتا بھی ہوگا اور سننا بھی ہوگا، جو بڑا ہو کر اس کے ساتھ کھیلے گا بھی اور اس کو بھائی جان بھی کہے گا۔ پھر بچے کے ذہن میں اس کے لیے فکر پیدا ہوگی کہ وہ رکھا کہاں جائے، وہ کیا کھائے گا اور کہاں سوئے گا؛ تب اُسے آسانی کے ساتھ بتلایا جاسکتا ہے کہ وہ تو اتنی کے پاس ہی رہے گا۔ انھیں کے پاس سوئے گا بھی، وہ تمہارا مٹا جو ہوا۔ اور اتنی ہی تمہارے منے کو دودھ بھی پلائیں گی۔ بہر حال بچے کو ہموار کرنا اور اُس کے دل میں آنے والے بچے کے لیے ہمدردی پیدا کرنا مشکل کام نہیں ہے۔ مگر ہمارے گھرانوں میں تو پہلے بچوں کے دل میں دوسرے بچے کی طرف سے حسد پیدا کر دی جاتی ہے۔ وہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اپنا حریف قرار دے لیتا ہے اور پھر اس کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ ہی پسند کرتا ہے۔

دوسرا بچہ اس کے گھر اچانک آتا ہے اور اس طرح آتا ہے کہ پہلا بچہ اپنی طرف دوسروں کی توجہ کو واضح طور پر کم پاتا ہے۔ اپنے ساتھ لوگوں کے برتاؤ میں یک لخت نمایاں تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ چیز اس کے لیے غیر متوقع ہوتی ہے جس کے لیے وہ پہلے سے تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اب وہ اس بچے سے دشمنی کرنے لگتا ہے۔ اگر نئے بچے کے آنے سے پہلے اس کو آگاہ کیا جاتا ہے اور اس کو یہ بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ مٹا چوں کہ اس کا ہے اس لیے سب کو اس سے محبت ہے تو پھر وہ رقابت محسوس نہ کرے گا اور نہ دوسرے بچے سے حسد اس میں جس طرح کی خرابیاں پیدا کر دیتی ہے وہ ہم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ صرف حسد ہی کو لے لیجیے جو لوگوں کو دوسے متنفر کر دیتی ہے کتنی بڑی چیز ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

”حسد سے بچو! اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا لیتی ہے جس طرح آگ

لکڑیوں کو خُلا کر خاک کر دیتی ہے۔“ (ابو داؤد)

اب آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ جب بچے کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو وہ کیا بن جائے گا اور اس انسان کی زندگی کتنی ہولناک ہوگی جس میں نیکیاں نہ ہوں گی؛

بغض اور نفرت دوسری خرابیاں ہیں جو اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کے پیدا ہونے کے بعد بچے سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے تمام معاملات کو انصاف اور رواداری کے ساتھ نمٹائے گا۔

ان سب پرستیزاں اس کی وہ حرکت ہے جس کے ذریعے وہ بہانے بنا کر ماں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔ یہ زوش بڑھنے بڑھتے اس میں جھوٹ اور مکر کی خصلت پیدا کر دیتی ہے۔ جھوٹ کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھ میں بتا ہی چکا ہوں۔ یہاں صرف رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول مبارک کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں؛

”جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی جہنم میں پہنچاتی ہے اور انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک وہ کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔“ (بخاری)

اللہ کی پناہ اس ناپسندیدہ حرکت سے!

یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد ایک بات آپ کے دل میں ضرور کھٹک رہی ہوگی کہ کوئی ماں اپنے بچے کے ساتھ اس طرح زیادتی نہیں کرتی، بے اعتنائی نہیں برتنی اور نا انصافی و ظلم نہیں کرتی۔ ٹھیک ہے وہ دانستہ ایسا نہیں کرتی۔ البتہ جب آپ یہ محسوس کریں کہ دوسرے بچے کے آجانے کے بعد آپ کا پہلا بچہ اس ڈھڑے پر چلنے لگا ہے جس کی مختلف صورتیں میں نے گذشتہ صفحات میں بیان کی ہیں تو آپ فوراً اس کا کھوج لگائیں کہ کس معاملے میں آپ سے کوتاہی ہوگئی ہے اور کس بات میں بچہ اپنے آپ کو اپنے حقوق سے محروم سمجھ رہا ہے۔ اس طرح جب آپ کے علم میں وہ بے توجہی آجائے گی تو آپ خود اندازہ کر سکیں گی کہ واقعی پہلے بچے کے ساتھ بے انصافی ہوگئی ہے۔



## بچے کا ضمیر

بچہ ایک چھوٹا موٹا کھلونا ہی تو ہے لیکن بے جان نہیں! عام کھلونے کو آپ جس طرح چاہیے رکھیے، اٹھائیے لیکن وہ جس سانچے میں ڈھلا ہے اُس نے اُس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ڈھال دی ہے وہ ماند نہیں پڑتی۔ بچے کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ڈانٹ دیجئے تو اُس کی آنکھیں پھلک پڑیں گی اور وہ رو دے گا، گود میں اٹھا کر پیار کر لیجئے تو اُس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل جائے گی۔ وہ بڑا نازک اور حساس کھلونا ہوتا ہے، اور چھپیدہ باطن کا حامل بھی!

پھر بچہ صرف بچہ ہی نہیں ہے، وہ مستقبل کا پختہ کار انسان بھی ہے۔ اپنی آنے والی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی صلاحیت کے ذریعے تیاری بھی کرتا رہتا ہے اور بہت کچھ سیکھتا بھی رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اُن تمام تجربات کا حامل نہیں ہوتا جو ایک بالغ انسان میں ہوتی ہیں لیکن ان تجربات سے گزرنے کے لیے اُس کے جسمانی نظام میں نا پختہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کو حالاں کہ آپ نظر انداز نہیں کرتے لیکن عموماً ایسا ہوتا ہے کہ آپ ان کو اہمیت بھی نہیں دیتی ہیں۔ یہ کوتاہی زیادہ تر بچے کے ضمیر کے سلسلے میں ہوتی ہے۔ اگر آپ توجہ سے دیکھیں تو آپ مشاہدہ کریں گی کہ بچے میں ایک وصف اُس کا ضمیر ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کلام پاک میں فرمایا ہے:

”اور نفس انسانی کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا اور پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا۔“ (الشمس، ۱۰ تا ۱۱)

یعنی یہ وصف انسان میں فطری طور پر ہوتا ہے کہ وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکے۔ اسی کی بنا

پر اُس میں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اپنے بھلے کے لیے کر رہا ہے۔ اپنے ضمیر پر یہ اعتماد بچے میں بھی ہوتا ہے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم اُس میں اپنے آپ پر یہ بھروسہ کرنے یا اعتماد کرنے کی صلاحیت، کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ پروان چڑھائیں۔ لیکن بعض والدین کے عمل سے یہ خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ یا تو وہ بچے کو ٹوک ٹوک کر، منع کر کر کے، اُس میں اعتماد پیدا نہیں ہونے دیتے یا اُسے اتنا چھٹولا، کم عمر تصور کرتے رہتے ہیں کہ اُسے اپنے آپ پر کبھی بھی بھروسہ نہیں ہو پاتا۔ ان دونوں صورتوں میں اُس کا ضمیر ٹھٹھہر کر رہ جاتا ہے اور وہ نا پختہ ہی رہتا ہے۔

آپ خود ملاحظہ کر لیں :

بچے کی طرف سے عام طور پر ہمارا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ بس بچہ ہی تو ہے۔ ہاں، یہ صحیح ہے کہ وہ صرف بچہ ہے، لیکن اس کو اہمیت نہ دینے کے لیے یہ دلیل کافی نہیں۔ آپ اُسے کھانا کھلاتی ہیں، پانی پلاتی ہیں، کپڑے پہناتی ہیں، آرام دہ بستر پر سلا دیتی ہیں۔ بس!؟ آپ ہنس کر کہیں گی کہ ”میری خدمت کو اس طرح انگلیوں پر گن کر تو نہ شمار کرا تے۔ ان سب کے پیچھے ایک پیارا اور ایک ممتا چھپی ہوئی ہے۔ اُسے آپ کس انگلی پر گنیں گے؟ میرے نزدیک یہی ممتا اہم ہے۔ اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس ممتا کی جگہ جب حاکمیت لے لیتی ہے تو سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔

بچہ اپنی ایک شخصیت رکھتا ہے۔ اُسے وہ قدم قدم، نقش نقش سجاتا رہتا ہے۔ ان نازک خطوط کو چھیر دیجیے تو اُس کی کائنات بکھر جاتی ہے اور وہ بڑی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ خرابی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب بچے کی شخصیت کا احترام نہیں کیا جاتا اُسے غیر اہم تصور کیا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ کچھ ایسا رویہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جب چاہے اُسے ٹوک دیجیے، روک دیجیے۔ یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ اُس کے احساسات و جذبات پر کیا بیٹے گی۔

بچہ یہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ اُس کی خواہش اور مرضی میں کوئی رکاوٹ ڈالے۔ ہاں یہ

ٹھیک ہے کہ اُس کی ہر خواہش درست یا مناسب نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے بڑوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اُسے مناسب خواہش کے انتخاب کرنے کا سلیقہ سکھائیں، لیکن یہ سلیقہ سکھانے کے انداز بھی تو مختلف ہوتے ہیں۔ سختی سے ٹوک دینے پر بچے سخت ناگواری محسوس کرتا ہے اور جذباتی طور پر الجھ جاتا ہے۔ اس لیے اگر نرمی اور محبت کے ساتھ اُس کو مناسب خواہشوں کی طرف موڑا جائے تو اُس کی شخصیت مجروح نہیں ہوگی۔ بچے جلسہ گاہ میں لٹکے ہوئے غباروں کے لیے مچل جاتا ہے۔ آپ ڈانٹ دیتی ہیں، "نہیں بدتمیز کہیں کے بدنیت!" ممکن ہے بچے سہم کر خاموش ہو جائے، لیکن اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے آپ نے جو اُسے ڈانٹ دیا ہے، وہ ٹھیس کون دور کرے گا؟

آپ بچے کے کپڑے بدل رہی ہیں۔ بچے کہتا ہے کہ وہ فلاں رنگ کی قمیص یا بٹن شمرٹ پہنے گا۔ آپ جھڑک دیتی ہیں، "نہیں، یہی پہنو، اُس میں کون سے لعل ٹکے ہیں۔ بچے ٹنڈو بسور کر رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے دل میں یہ بھی سوچ رہا ہو، "واہ میری پسند کوئی پسند ہی نہ ہوئی!" ممکن ہے کہ اس کے الفاظ اتنے ڈھلے ڈھالے نہ ہوں، لیکن احساس تو ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ حال یہاں پھر اس کی شخصیت مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔

آپ آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔ بچے کا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی کچھ بولے، اور وہ بول دیتا ہے۔ آپ کے نزدیک یہ بدتمیزی ہوتی۔ آپ اسے گھڑک دیتی ہیں، "تجھ سے کس نے کہا تھا بیچ میں بولنے کو؟" بچے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس نے کون سی بدتمیزی کی ہے، یا ناگواری کی اُس نے کون سی بات کہہ دی۔ یہ الجھن اُسے کچھ عجیب انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

آپ مہانوں کی خاطر داری میں لگی ہوئی ہیں۔ بچے کو اس سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ وہ بیچ کمرے میں یا دالان میں اپنے کھلونے پھیلا کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی مصحوم دنیا میں مگن ہو جاتا ہے۔ یہ پھوٹ پھوٹتا ہے آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ آپ اُس پر برس پڑتی ہیں۔ وہ اپنے کپڑے گندے کر لیتا ہے۔ مٹن اُٹے سیدھے لگا لیتا ہے، جوتے کی ڈوریاں کھول ڈالتا ہے، یا بال بے ترتیب کر لیتا ہے اور آپ اُس کی بدسلوکی پر واویلا مچانے لگتی ہیں۔ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اپنی رسوائی اُس کو بہت گراں گزرتی ہے۔ اپنی

ہتک وہ کیسے برداشت کر لے!

بچے کے ساتھ برتاؤ کا ایک انداز یہ ہے جس میں سخت مزاحی اور غصہ کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا انداز وہ بھی ہوتا ہے جس میں محبت اور ممتا کو ضرورت سے زیادہ دخل ہوتا ہے۔ جی ہاں، ضرورت سے زیادہ!

آپ کے مہمان آئے ہوئے ہیں، آپ خوش گپیوں میں مگن ہیں۔ پھر اچانک آپ کی ممتا جوش مارتی ہے: "آشی، یہاں تو آنا لاڈو، ذرا اپنی آنٹی کو وہ چڑیا والی نظم تو سنانا" اور بچی چابی والے کھلونے کی طرح شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی آپ اُس سے کہانی سنواتی ہیں، کبھی گنتیاں، کبھی پہاڑے، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اس برتاؤ میں بچی کے لیے کہیں کوئی ناگواری نہیں ہے، لیکن دوسروں سے قریب آنے کا وہ صرف ایک ہی طریقہ سیکھ پاتی ہے۔ چابی والے کھلونے کا طریقہ! بچہ کبھی کچھ خود کرنا چاہتا ہے۔ آپ اُس کی طلب کے بغیر اُس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ آپ اُسے نہیں کرنے دیتیں، خود کر دیتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتا، لیکن آپ اپنی ممتا میں اُسے نظر انداز کر دیتی ہیں، اُسے ایک عجب بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔

بہت سے موقعے ایسے آتے ہیں، جب بچہ اپنے حوصلے سے بڑھ کر کچھ سوچتا ہے اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہے لیکن آپ بار بار اُسے احساس دلاتی ہیں کہ "ابھی تم چھوٹے ہو" مثلاً آپ کہیں جانا چاہتی ہیں، آپ کو رکشہ یا سواری کی ضرورت ہے۔ بچہ کہتا ہے: "امی، میں بلا لاؤں؟" آپ کہتی ہیں: "ارے نہیں بیٹے، تم مت جانا۔ تم بہت چھوٹے ہو۔" آپ کسی مسئلے پر غور کر رہی ہیں، بھولیوں سے مشورہ کر رہی ہیں۔ دس بارہ سال کا بچہ کہتا ہے: "امی یوں کر لیجئے زیادہ بہتر رہے گا۔" ممکن ہے، بعد میں آپ کو اسی طرح کرنا پڑے، لیکن اُس وقت آپ اُسے جواب دیتی ہیں تو یہ: "بیٹے، یہ تمہاری عمر سے بڑی بات ہے۔" غرض اس طرح کے کتنے ہی مواقع آتے ہیں۔ جب بچہ جھنجھلا کر رہ جاتا ہے۔ اُسے اپنے آپ کو کم عمر تصور کیے جانے پر اعتراض ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے بھی بڑا تصور کیا جائے۔

اپنے ہم عمروں اور بھولیوں کے درمیان بچہ اپنی سبکی برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ سبکی سزائش کے انداز میں کی جائے یا لاڈ پیار میں! بچہ اپنے ہم عمروں کے درمیان اپنا بھرم

قائم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی انا اور اپنے ضمیر کا اعتراف چاہتا ہے۔ وہ ان کے درمیان اس طرح رہنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھی اس کی اہمیت کے قائل ہوں۔ اگر اس اہمیت کو آپ اپنی جھڑکی یا لاڈ میں گھٹادیں تو اُسے اپنی توہین کا احساس ہوتا ہے جس کو وہ انگیز نہیں کر پاتا۔ کوشش کیجیے کہ اس طرح آپ اُس کی خود پسندی کو چوٹ نہ پہنچائیں۔

ان مختلف مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچہ اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حیثیت اُسے عزیز ہوتی ہے۔ اُسے کیا، ہم سب کو عزیز ہوتی ہے۔ اُس کی شخصیت کی صحت مند اور پسندیدہ نشوونما کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کی ذات کا مناسب اعتراف کیا جائے۔ اُس سے، اس میں شک نہیں کہ غلطیاں بھی ہوں گی اور معصوم لغزشیں بھی۔ ایسے مرحلوں میں صالح تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے ضمیر کو ضرب پہنچائے بغیر اُسے صحیح راہ پر ڈال دیا جائے تاکہ وہ صحت مند طور پر پروان چڑھ سکے۔

بہت زیادہ ڈانٹنے، جھڑکنے سے اس کا ضمیر پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور اُس کی شخصیت منتشر ہو جاتی ہے۔ پھری ہوئی ذات کا حامل فرد صحیح اور صالح انداز میں نہ تو سوچ سکتا ہے اور نہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ اُس میں ابتداء سے ہی ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ انجام کار یہاں تو وہ بزدل اور ڈرپوک بن جاتا ہے یا باغی ہو جاتا ہے۔ میں اس سانحہ کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا کہ ایک صالح اور خدا کا خوف کھانے والے بزرگ کی ایسی ہی سختیوں نے جن کی مثالیں میں اُوپر دے چکا ہوں، ان کی ساری اولادوں کو جراثیم پیشگی پر مجبور کر دیا۔ ان لڑکوں کی گفتگو میں ہمیشہ میں نے بغاوت کی جھلک دیکھی ہے۔

اس کے برخلاف اگر آپ اپنی غیر معمولی محبت ہی کی وجہ سے ہی، بچے کو اپنی صلاحیتوں کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا موقع نہ دیں گی تو وہ سمٹ کر ٹھٹھر کر رہ جائے گا، اور اُسے اپنی ذات پر اعتماد کرنا نہ آئے گا۔ اُسے ہر وقت یہ احساس دلانا کہ وہ ایک ننھا بچہ ہے، اس کے اندر ناپسندیدگی کے رجحان کو پروان چڑھا دیتا ہے۔ اس لیے دانش مندی اس میں ہے کہ اُس کو اپنے حوصلوں کو بلند کرنے کا موقع فراہم کرتی رہیں۔

بچے کو اگر یہ اطمینان حاصل رہے کہ وہ اپنی اہمیت یا اپنے مقام سے محروم نہیں کیا

جارا ہے تو اُس کی شخصیت کی صحت منہ تعمیر ہو سکے گی۔

## معاشرہ کی کج رویاں

ہمارے اس دور کی ایک بڑی لعنت ظلم و تشدد ہے۔ ہم نہیں چاہتے لیکن پھر بھی وہ سب کچھ ہوتا ہے جس سے انسانیت کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ بوڑھے بچے، عورتیں نہ صرف بے دردی کے ساتھ قتل کیے جاتے ہیں بلکہ گھروں میں یا برسرِ عام سڑکوں پر جلاد دیے جاتے ہیں۔ ان کی داد فریاد اور چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ان ظالموں میں وہ بھی کھلے عام شریک ہوتے ہیں جو عوام کے دکھوالے کہلاتے ہیں۔ اور یہ دکھوالے اپنی درندگی اور حیوانیت میں تو ظالموں سے بھی بڑے ظالم ثابت ہوتے ہیں۔ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ عام انسانوں کو تو علم بھی نہیں ہوتا۔ وہ چین آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے ہیں، اپنی روزمرہ کی زندگی میں مصروف ہوتے ہیں کہ اچانک پتہ چلتا ہے کہ ان کے محلے گلیوں پر فساد یوں کا حملہ شروع ہو گیا ہے۔ گھر ٹوٹے جا رہے ہیں، جلانے جا رہے ہیں، لوگ قتل کیے جا رہے ہیں، عورتوں کی عصمتیں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو وردی پوشوں کی گولیاں اُسے تھلنی کر ڈالتی ہیں۔ مجبور و بے بس انسان! کیا کرے؟ اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ سب ہو گا۔ لیکن ہوتا ہے، ہوتا ہے! اور ستم یہ ہے کہ ان فساد یوں، ظالموں اور ٹیڑھے قاتلوں کو نہ کوئی پکڑتا ہے اور نہ سزا دیتا ہے۔ بلکہ سب ان کی مدافعت کرتے ہیں، ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ چنانچہ یہ اشرار بھی فخر کے ساتھ، سینہ تان کر اپنے کرتوت بیان کرتے ہیں۔ کوئی ان کو پکڑنے والا نہیں، ان سے پوچھنے والا نہیں۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ظلم و تشدد کی وارداتیں دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ جو لوگ ان اشرار کی سرپرستی کرتے ہیں ان کو ان تمام غیر انسانی حرکتوں سے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کے سرپرست کچھ بولیں گے تو وہ خود ان سرپرستوں پر پلٹ پڑیں گے۔ بہر حال یہ

شکر کا ایسا نہ ختم ہونے والا تباہ کن چکر ہے کہ جس میں مظلوم و بے سہارا لوگ ہمیشہ مچھنے رہتے ہیں اور تباہ و برباد ہوتے رہتے ہیں۔

بے گناہ و بے قصور مظلوموں پر یہ شیطانی حملے ہوتے کیوں ہیں؟ یہ سوال اکثر ستم رسیدہ لوگ کرتے ہیں جس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ حرکتیں مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں ہوتی ہیں۔ پھر خود ہی یہ جواب دینے والے کہتے ہیں کہ ظلم و زیادتی کی تعلیم کوئی مذہب نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ اگر آپ ذرا سا غور کریں اور حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ مذہب کے نام پر باطل کے پرستار جو درندگی اور تباہ کاری پھیلاتے ہیں اُس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ تو سیاسی، معاشی اور سماجی فائدوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ کوئی سیاسی پارٹی کسی دوسری سیاسی پارٹی کو بدنام کرنا چاہتی ہے، کوئی الیکشن میں زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کوئی کسی دوسری پارٹی کی حکومت ختم کرنا چاہتی ہے کوئی اپنے مقابلے میں دوسرے تاجر کو گرانا چاہتا ہے، کوئی دستکاری کے کسی پیشے سے دوسری قوم کو بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ کوئی بھنگی جھونپڑی کے مکینوں کی زمینوں پر قبضہ کر کے عالیشان تجارتی عمارتیں بنانا چاہتا ہے۔ ان سب دنیاوی اور حقیر فائدوں کے لیے مذہب کے نام پر ٹوٹ مار، آتش زنی، قتل و غارت گری کی جاتی ہے اور الزام اپنے سر لینے کے بجائے مذہب کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔

شکر ہمیشہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور جھوٹ کے سہارے سے ہی اپنی گمراہی پھیلاتا ہے اور حاوی رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس ظلم کا نشانہ ہمیشہ کمزور اور بے سہارا لوگ ہوتے ہیں اور انہیں نہتوں پر وہ فتح بھی پاتا ہے۔

ممکن ہے آپ کو یہ خیال ہو کہ میں جذباتی ہو گیا ہوں یا بلاوجہ تقریر کرتا جا رہا ہوں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ میں جس طرف آپ کو متوجہ کرانا چاہتا ہوں اُس کے لیے یہ تفصیل بہت ضروری ہے۔

آپ بتائیں کہ کیا ہم ان حالات کو پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں؟ اگر ایسے حالات

پیدا ہو جائیں تو کیا ہم انہیں روک سکتے ہیں؟ دونوں کا جواب صرف ایک ہے یعنی نہیں! پھر جب یہ مباحہ کاری و درندگی بے گناہوں اور بے قصوروں کو اجاڑنے اور مٹانے لگتی ہے تو ہم خود کو اُس سے بچا بھی نہیں پاتے۔ اس تباہی اور بربادی سے ہم ہی نہیں، ہمارے بچے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بہت سے بچے شیطانوں کے ظلم کا نشانہ بن جاتے ہیں، قتل کر دیے جاتے ہیں، زندہ جلادے جلتے ہیں۔ بہت سے بچے زندہ جلائے تو جاتے ہیں، گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں یا ہتھیاروں کے وار سے زخمی تو ہوتے ہیں لیکن زندہ بچ جاتے ہیں مگر زندگی بھر کے لیے معذور ہو کر!۔ بہت سے بچے زخمی بھی نہیں ہوتے لیکن اُن کے سامنے یا تو اُن کے ماں باپ کو اور دوسرے گھر والوں کو قتل کیا گیا ہے، جلایا گیا ہے، عصمتیں لوٹی گئی ہیں۔ بہت سے ان شیطانی حملوں سے تو محفوظ رہتے ہیں لیکن عام ماحول میں جو خوف و ہراس پھیلا ہوتا ہے، چیخ و پکار اور نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں اُن سے ان کے ماں باپ اور دوسرے گھر والے اس حد تک خوف زدہ اور بے اُوسان ہوتے ہیں کہ بچے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

یہ خوف کا صدمہ اور بے روک ٹوک ظلم کا راج بچوں میں صرف خوف ہی نہیں پیدا کرتا بلکہ اُن کی ذات کی تعمیر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اُن کا تجربہ یہ ہوتا ہے کہ ظلم و درندگی سے روکنے والا کوئی نہیں۔ ان کے گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کی عصمتیں لٹیں، سب کو ٹکڑے ٹکڑے کاٹا گیا اور جلایا گیا۔ گھروں کو ٹوٹا گیا اور اُن میں آگ لگائی گئی، کوئی بچا لے نہیں آیا، مدد کرنے نہیں آیا۔ یعنی اگر طاقت کا استعمال کیا جائے، ظلم کیا جائے تو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ گویا طاقت اور ظلم ہی جیت کا واحد ذریعہ ہے۔

طاقت کا مظاہرہ کیسے کیا جائے اور کن پر کیا جائے؟ یہ بھی بچہ اشرار کے ننگے وحشی ناپٹک کے ذریعہ جان جاتا ہے۔ اُس کے لیے ہتھیار، گولا، بارود، چاقو، پستول وغیرہ عام زندگی کے استعمال کی چیزیں بن جاتی ہیں۔ اور ان کے استعمال کو وہ معمولی سی بات سمجھنے لگتا ہے۔

اپنی بات کو منوانے اور غلط بات کو بھی صحیح ثابت کرانے کے لیے وہ ہتھیار کا استعمال



کرنے لگتا ہے۔ امتحانات میں چاقو اور پستول کا رواج اسی رویہ کی وجہ سے ہو گیا ہے۔  
بچہ دلیل اور عقل سے کام لینے اور ٹھنڈے مزاج سے سوچنے کی بجائے جذبات  
اور اشتعال سے کام لینے کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ بڑی جلدی وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور سرکشی پر  
آمادہ ہو جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اس سرکشی کو سرکشی ہی تصور نہیں کرتا بلکہ اپنی  
بات منوانے کا صحیح ترین طریقہ سمجھتا ہے۔

ایسے زمانے میں جب ماحول پُر سکون ہوتا ہے اور کسی طرح کی کوئی بد امنی نہیں  
ہوتی، ان لڑکوں کو اپنا جذباتی اُبال نکالنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے  
جرائم میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مثلاً چوری، گرہ کٹی، گلے کی زنجیر کھینچنا، عصمت دری کی وارداتیں  
نوعروں میں عام ہو گئی ہیں۔ ان بڑے لڑکوں سے یہ حرکتیں چھوٹے بچوں میں ہم جولیوں کے  
ذریعہ منتقل ہو جاتی ہیں۔

اثرار میں منشیات (نشلی چیزوں) کا استعمال شوقیہ ہوتا ہے بلکہ اسے شان تصور کیا  
جاتا ہے۔ ان کی خرید و فروخت بھی جاری رہتی ہے۔ کیوں کہ پُر امن حالات میں آمدنی کا یہ  
بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔ منشیات کے استعمال سے کتنے گھر تباہ ہوئے ہیں اور ہوتے جا رہے  
ہیں؛ بیان کرنے اور شمار کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب ہی جانتے ہیں یہ سب ہمارے  
تخریب کار معاشرے کی دین ہے۔

مگر ابھی اور تشدد پھیلانے کے لیے سماج دشمن اور انسان دشمن لیڈر جس زبان میں  
جس طرح کی تقریریں کر رہے ہیں جن کے نتیجے میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی ہے،  
وہ زبان اور وہ تقریریں بچوں کو ہماری لفظیات (Vocabulary) سے مختلف  
لفظیات عطا کر رہی ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ اشتعال اور بے رحمی کی زبان سیکھتے ہیں اور ہر بات  
میں اپنی قوتِ بازو کی دھکی دینا سیکھ جاتے ہیں۔ اپنی تشدد پسندی کی وجہ سے یہ عام گفتگو  
کے آداب سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر بات میں اور ہر ایک پر اپنا حکم چلانے  
لگتے ہیں۔

مزاج میں تشدد پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہ بچے اپنی پوشاک اور اپنے چہرے

مہرے سے بھی "دادا" نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوسرے اُن سے ڈریں اور ڈریں۔ اُن کے چلنے کے انداز میں بھی اکڑا اور رعونت ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب وہ چلتے ہیں تو زمین ہل جاتی ہے۔

ان ساری خاصیتوں پر غور کیجیے تو ایک عجیب گھردری بے رحم اور خود غرض شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ بچے صرف دوسروں کے لیے ہی عذاب نہیں ہوتے ہیں بلکہ خود اُن کی اپنی ذات اپنے دشمنوں اور سرپرستوں کے غضب کا نشانہ بن جاتی ہے اور وہ ختم کر دیے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بچے قصور وار نہیں ہیں بلکہ انھیں اس راہ پر ڈالنے والے مجرم ہیں۔ ان مجرموں کی طرف اشارہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔

جب بچہ اپنی نظر کے سامنے قتل، غارت گری، آتش زنی، عصمت دری سب ہی کچھ ہوتے دیکھتا ہے اور وہ بے بس ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بے پناہ اشتعال پیدا ہوتا ہے، اس کے اعصاب میں ناقابل برداشت تناؤ پیدا ہوتا ہے اور بدلہ لینے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ ان درندوں شیطانوں سے کیسے وہ بدلہ لے؟ کیسے وہ اُس سے بھی زیادہ ان کو تکلیف پہنچائے جتنی وہ اُس کے اپنے عزیزوں کو پہنچا رہے ہیں؟ بس یہیں سے بچنے میں تشدد بھڑک اٹھتا ہے اور وہ کجرو ہو جاتا ہے۔ بچوں کو اس طرح بگاڑنے اور بھٹکانے کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا لیکن سماج دشمن شیطانوں کے سرپرست بالواسطہ اس کجی کی طرف موڑنے والے اور بھلائی سے بھٹکا کر بُرائی کی راہ پر لگانے والے بن جاتے ہیں۔ گویا سماج کے ٹھیکیدار ہی سماجی تباہی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ پھر بعد میں سماج کی اصلاح کے لیے فکر مند ہوتے ہیں۔ کیا خوب تماشا ہے کہ خود ہی آگ لگاتے ہیں اور خود ہی پانی کے لیے دوڑتے ہیں۔ اشرار بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام دنوں میں جن جرائم پر وہ جان سے ہاتھ دھو سکتے ہیں فسادات کے دنوں میں ان سے کہیں بڑے جرائم پر ان کو کوئی پکڑنے والا نہیں ہوتا بلکہ اُن کی طرف والے ان کے حمایتی بن جاتے ہیں۔ بچے جرائم کی اس پشت پناہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھر خود بھی اس راہ پر نڈر ہو کر چل نکلتا ہے۔ لیکن اصل مسئلہ ہمارے آپ کے لیے یہ ہے کہ بچے کو اس راہ پر چلنے سے روکا

کیسے جائے، شرکی پیروی کرنے کے بجائے خیر کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب کیسے دی جائے؟  
اشرار کے پیدا کیے ہوئے ان حالات اور ماحول پر نہ آپ کا کوئی اختیار  
ہے اور نہ یہ آپ کے بس میں ہیں۔ یہ تو آپ پر مسلط کیے جاتے ہیں عذاب کی طرح! آپ  
کو ان کا سامنا کرنا ہی ہے چاہے آپ پسند کریں یا نہ کریں۔ بس پہلا تاثر بچے کے ذہن میں  
مہی پیدا کرنا ہو گا۔ اس سے بچے میں یہ تصور سختہ پڑے گا کہ شر، ظلم، تشدد وغیرہ پسندیدہ طور  
پر لیتے نہیں ہیں۔

انہیں یہ بتائیے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا  
خاندان ہیں۔ اس لیے وہ لوگ جو دوسروں کو قتل کرتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، بھلانے میں اور  
دوسری بہت بڑی بڑی تکلیفیں پہنچاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے خاندان کو نقصان پہنچاتے  
ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اللہ کے  
دشمنوں کا راستہ اختیار نہ کریں کیوں کہ وہ تباہی و بربادی کا راستہ ہے۔

ظلم و تشدد کی وجہ سے جو لوگ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، ان کے بچوں کا بھی متاثر  
ہونا فطری بات ہے۔ یہ صدمہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ  
سکتا۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہم آپ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی موقعوں کے لیے اللہ سبحانہ و  
تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار متعدد جگہوں پر ہدایت کی ہے کہ صبر اور صلاۃ یعنی نماز و عبادت  
کے ذریعے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مدد مانگو۔ ظلم و ستم کا نشانہ بننے والی خواتین تو ایسا کریں ہی اپنے  
بچوں کو بھی اس کی نصیحت کریں۔ انشاء اللہ ذہن شر اور کجی کی طرف نہ مڑے گا۔

کل تک جن کے پاس سب کچھ تھا پل کے پل میں ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ اسی  
حالت میں اللہ کی طرف سے اور خیر کی طرف سے مایوس ہو جانا عین ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا  
ہے تو یہ شرکی فتح ہوتی ہے۔ شر تو چاہتا ہی یہی ہے۔ اسی انجام کے لیے وہ اتنی تباہی مچاتا  
ہے، تاراجی کرتا ہے۔ اگر ایسی صورت حال میں امانت کی تلقین کی جائے تو محرومی کا صدمہ کم  
ہو سکتا ہے جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے دیا تھا، اسی نے واپس لے لیا۔ اس  
کی مرضی! ہم اسی سے مانگیں گے وہی دے گا۔

ظلم و ستم کا شکار بننے والے دوسرے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جن پر ہم سے زیادہ مصیبتیں آئی ہیں، ہم سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوتے ہیں۔ ان سے اگر ہم اپنا موازنہ کریں تو ہمیں اپنی تکلیف اور مصیبت کا احساس کم ہوگا۔ ایسے موقعہ پر اگر ہم اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ان کلمات پر غور کریں تو ہمیں بڑی ڈھارس ملے گی:

”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالفت فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے اتار چڑھاؤ ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (ناستی کے) گواہ ہوں۔“

(آل عمران : ۱۳۰-۱۳۹)

بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر ہی وہ طریقہ ہے جس سے بڑے سے بڑا گھاؤ بھر جاتا ہے۔ لیکن اس صبر کی سب سے اہم خوبی یہ ہونی چاہیے کہ ہم حق اور خیر کے راستے سے ایک قدم نہ ہٹیں۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے :

”جو شخص ثواب دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثواب آخرت کے ارادہ سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کہتے ہی نبی ایسے گذر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔“

(آل عمران : ۱۳۶-۱۳۵)

مصیبت زدوں کی مدد اور راحت رسانی کا کام ہماری اپنی تکلیفوں کو کم کر دیتا ہے۔

اپنے مصائب کو بھلانے کا یہ بہترین طریقہ ہوتا ہے۔ بچوں سے ایسے کاموں میں عملی مدد لیں۔ اس طرح ان کا ذہن تخریبی رُخ پر کام کرنے کے بجائے تعمیری رُخ پر کام کرنے لگے گا۔ مصیبت زدوں کو طبی امداد اور خوراک و پوشاک کی فراہمی وغیرہ ایسے کام ہیں جن میں بچے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ انھیں ان کاموں میں لگائیے، ان میں صالح ذہن و کردار پروان چڑھے گا۔

یہ نہ بھولیں کہ جس طرح آپ کا ذہن کام کرے گا اسی انداز سے بچوں کا ذہن بنے گا۔ اس لیے بہت ہی خراب حالات میں بھی آپ کو خود پر قابو رکھنا ہوگا تاکہ آپ کا وقتی اشتعال آپ کے بچوں کو نہ بگاڑ دے۔

اشرار کے حملے اور تباہ کاریاں اتنی عام ہوتی جا رہی ہیں کہ مظلوموں اور بے کسوں کے لیے جان و مال اور عزت و آبرو بچانا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں کمزوروں اور نہتوں کی شہادتیں بے چارگی و بے بسی کی ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے اپنے بچاؤ کے لیے خود کو بھی تیار کرنا چاہیے اور اپنے بچوں کو بھی تربیت دی جاہیے۔ لیکن یہ بات اپنے ذہن میں بھی واضح رہنی چاہیے اور اپنے بچوں پر بھی واضح کرتے رہنا چاہیے کہ انھیں جو تربیت دی جا رہی ہے وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہے، دوسروں پر ظلم یا حملہ کرنے کے لیے نہیں! ظالم ہمیشہ اللہ کی مخلوق کا دشمن ہوتا ہے، اس لیے وہ خدا کا بھی دشمن ہوتا ہے۔ آپ کا ہاتھ صرف اس ظالم کی کلائی پکڑنے کے لیے اٹھے کسی بے قصور پر ظلم کرنے کے لیے نہیں!

اسلام کے معنی اگر بندگی کے ہیں تو سلامتی یا امن کے بھی ہیں۔ اس لیے آپ کی امکانی کوشش امن و سلامتی کے لیے ہونی چاہیے۔ کبھی بڑھ کر قانون توڑنے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہ بات آپ اپنے بچے کے ذہن میں بھی اچھی طرح بٹھادیں۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (الانفال، ۶۶) اور امن بغیر صبر کے قائم نہیں ہوتا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس وقت باطل خوف کی اور بزدلی کی لڑائی لڑ رہا ہے لیکن آخر کار اُسے ختم ہونا ہے اور حق کو آنا ہے۔ (بنی اسرائیل: ۸۱) اس

یہ اپنے بچے کو حق کی راہ پر ڈالے۔ اسی میں اُس کے لیے خیر ہے۔

## چند لفظوں میں

○ بچے کی تربیت کی ذمے داری صرف ماں پر نہیں، باپ پر بھی ہے۔

### کچر و والدین

○ بچوں کے سامنے بے پروائی کے ساتھ، غیر محتاط طور پر، عمل کرتے رہنا درست نہیں، کیوں کہ غیر ذمے دارانہ ماحول میں رہ کر بچہ غیر ذمے داری کی زندگی گزارنا سیکھتا ہے۔

○ آپ بچے کی طرف سے بے اعتنائی برتیں گی تو بچہ غلط ماحول کا انتخاب کر لے گا۔  
○ بے انتہا پابندیاں بھی عائد نہ کیجیے، ورنہ بچہ اکتا کر ساری پابندیوں کو توڑ ڈالے گا۔

○ اپنا حکم سختی کے ساتھ نہ منوائیے، ورنہ موقع پاتے ہی بچہ نہ صرف آپ سے بلکہ آپ کے اصولوں سے بھی بغاوت کر دے گا۔

○ بچوں کے معاملے میں ہمیشہ عیب چینی سے کام نہ لیجیے۔ ورنہ بچہ انتقاماً کج روی اختیار کر لے گا۔

○ بے جالا ڈ پیار بچے کو اچھے بُرے کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ بچے کو خود اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچنے کا موقع دیجیے۔

○ بچے کو وقت سے پہلے بزرگ نہ سمجھیے ورنہ آپ کی نظر میں ناقص ہونے کی وجہ سے خود بھی ناقص بن جائے گا۔

○ بچہ کم عمری میں اطاعت و فرماں برداری کے لیے تیار ہوتا ہے۔ آپ اُسے طعنے اور طنز سے اپنے مقابل نہ کھڑائیجیے۔

## دوسرا بچہ بحیثیت شریک

- دوسرے بچے کے پیدا ہونے پر بھی پہلے کو اپنا حق ملنا چاہیے۔ اس کے ساتھ محبت، شفقت اور توجہ اتنی ہی زیادہ رہنی چاہیے جتنی پہلے تھی۔ ورنہ وہ دوسرے بچے کو اپنا دشمن سمجھنے لگے گا۔
- بچپن میں اگر بچہ آپ کی ناز برداریوں سے محروم رہا تو ساری زندگی وہ یہی تشنگی محسوس کرتا رہے گا۔
- آنے والے بچے کے لیے پہلے بچے کے دل میں پہلے ہی سے محبت اور دل چسپی کے تاثرات پیدا کر دیں۔

## بچے کا ضمیر

- بچے کی ناپختہ صلاحیتوں کو نظر انداز نہ کیجیے۔
- بچہ دوسروں کے سامنے اپنی ہتک گواریاں نہیں کرتا۔
- بچے کو یہ بات کھلتی ہے کہ اُسے ہمیشہ بچہ ہی تصور کیا جائے۔
- اپنے ہجولیوں کے درمیان بچہ اپنی رسوائی پسند نہیں کرتا۔
- بچہ اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور یہ حیثیت اُسے عزیز ہوتی ہے۔
- بچے کی ذات مجروح ہو تو اُس کی شخصیت منتشر ہو جاتی ہے اور وہ صحیح و صالح انداز میں سوچنے اور فیصلہ کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔
- بچے کو آزادانہ طور پر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا موقع دیکھیے تاکہ اُسے اپنی ذات پر بھروسہ کرنا آجائے۔
- بچے کی اہمیت اور مقام کا اعتراف کیجیے تاکہ اُس کی شخصیت صحت مند انداز میں پروان چڑھ سکے۔

## معاشرہ کی کج رویاں

- آجکل کے معاشرے کا سب سے بڑا بگاڑ ظلم و تشدد ہے جس پر روک لگانے والا کوئی نہیں۔
- فساد یوں، ظالموں اور لٹیڑے قاتلوں کو نہ کوئی پکڑتا ہے اور نہ سزا دیتا ہے اس لیے یہ اپنے شر اور شیطنیت پر فخر کرتے ہیں۔
- شر اور فساد مذہب کے نام پر پھیلا یا جاتا ہے، لیکن مذہب کا تعلق باطل سے نہیں خیر سے ہوتا ہے۔
- شر اور فساد پھیلانے میں عام انسان کا ہاتھ نہیں ہوتا لیکن تباہ و برباد وہی ہوتا ہے۔
- ظلم و تشدد کا شکار بچے بھی ہوتے ہیں اور ان حالات سے وہ متاثر بھی ہوتے ہیں۔
- تشدد اور تخریب کاری کو بچہ جائز و صحیح سمجھنے لگتا ہے۔
- بچہ دلیل اور عقل سے کام لینے کے بجائے جذبات اور اشتعال سے کام لینے لگتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ بن جاتا ہے۔ منشیات کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔
- زور زبردستی کا عادی ہو جانے کی وجہ سے وہ دینی، اخلاقی اور سماجی آداب و تہذیب کو بھی ترک کر دیتا ہے۔
- ان حالات میں بچے کے ذہن کو حق اور خیر کی طرف موڑنے کی بے حد ضرورت ہے۔
- تمام مخلوق اللہ کا خاندان ہے۔ اس لیے جو مخلوق کا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے۔ بچے کو بتائیے کہ وہ اللہ کے دشمنوں کا طریقہ اختیار نہ کریں۔
- ظلم و تشدد کے زمانے میں بچے کو صبر و صلاۃ کے ذریعہ اللہ کی مدد مانگنا سکھائیے۔
- بچے کے ذہن کو اس طرح تربیت دیجیے کہ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ اللہ کی امانت تھا۔ اُس نے واپس لے لیا۔ اُس کی مرضی! ہم اُسی سے مانگیں گے، وہی دے گا۔
- بچے کو سمجھائیے کہ ظلم و ستم کا شکار دوسرے بھی ہیں اور اُن پر ہم سے زیادہ مصیبتیں



- آئی ہیں۔ اس طرح اپنی مصیبت کا احساس کم ہو جائے گا۔
- راحت رسانی کے کاموں میں بچے سے مدد لیجیے۔ اس طرح اس کا ذہن تخریب کے بجائے تعمیری و صالح بنے گا۔
  - اپنے بچاؤ کے لیے بچوں کو بھی تربیت دیجیے۔
  - بچاؤ کے علاوہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے سے بچوں کو بھی بازر کھیے۔
  - اسلام امن و سلامتی کی دعوت دیتا ہے اس لیے بچے کو امن و سلامتی کا ہی راستہ دکھائیے۔

# بچوں کی صالح تعلیم

بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں تمام احتیاطوں کے بعد ایک اور اہم مسئلہ سامنے آتا ہے، اور وہ ہے ان کو کچھ سکھانا۔ آپ خود ہی سمجھ سکتی ہیں کہ صرف روکنے ٹوکنے سے اور احتیاط برتنے سے تو کام نہیں چل سکتا، بلکہ اگر آپ اپنے بچے کو مسلسل ٹوکتی رہیں تو اس کا ذہن اُلجھ کر رہ جائے گا، وہ چکر اچائے گا اور یہ صورت حال اس کے لیے بہت بڑی اُلجھن بن جائے گی۔ وہ نپسلہ ہی نہ کر پائے گا کہ وہ کیا کرے؟

بہر وقت کی روک ٹوک اس کو کچھ ایسی حالت میں مبتلا کر دے گی کہ اُسے جیسے انتہائی تار یک کمرے میں ڈھکیل دیا جائے اور اس سے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کے لیے کہا جائے۔ اب وہ بے چارہ کیا کر سکے گا، سوائے اس کے کہ ٹانگ ٹوٹیاں مارتا پھرے۔ راستہ اگر وہ یہ وقت تلاش بھی کر لے تو کیا حاصل؟ یہ بھی تو دیکھیے کہ اس نے ٹھوکریں کتنی کھائی ہیں؟ پھر یہ بھی تو غور کیجیے کہ جو فرد اپنی زندگی میں مسلسل ٹھوکریں کھاتا رہے اس کا حال کیا ہوگا؟

اس لیے آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے بچے کو ٹھوکریں کھانے سے، بھٹک جانے سے، بے راہ زو ہونے سے بچائیے۔ جس بچے کو مسلسل ٹوٹا جائے گا وہ غبی ہو جائے گا، اس کی ذہانت اس کے اندر سے فنا ہو جائے گی۔ وہ قدم قدم پر جھکے گا کہ آیا وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔ پھر مسلسل روک ٹوک مند بھی تو پیدا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زندگی میں جہاں بچے کو عمل کی گمراہیوں سے بچانا ہوتا ہے وہاں اس سے بڑھ کر یہ فرض بھی ہم پر مائد ہوتا ہے

کہ اس کی رہنمائی کریں اور اپنے تجربات اور تاثرات سے اس کو کم سے کم خطرات و خدشات اور ناکامیوں کا سامنا کرنے دیں۔ آخر چراغ سے چراغ جلتا ہے نا! تو پھر اپنے چراغ سے دوسرے چراغوں کو جلنے سے کیوں محروم رکھیں۔

اس سے پہلے بھی میں آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ عمر کے ابتدائی چار سال بڑے قیمتی ہوتے ہیں، ان میں بچے کو جو کچھ سکھا دیا جائے وہ بے حد پائیدار ہوتا ہے اور اس کے نقوش کافی عرصے تک نہیں بلکہ ساری عمر باقی رہتے ہیں۔ ہاں! اس چار سال کی عمر کے بعد کے سال بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتے۔ بچپن کا ایک ایک لمحہ گویا کسی تربیت گاہ میں گزرتا ہے۔ اب اس تربیت گاہ میں وہ کیا سیکھتا ہے؟ یہ اس کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ اگر اسے اچھی باتیں سکھائی گئیں تو وہ ایک اچھا طالب علم ثابت ہوگا اور اگر بُری باتیں سکھائی گئیں تو وہ بُری باتیں سیکھ کر بُرا طالب علم بنے گا۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو بول کر گئیوں کاٹے جائیں، یعنی ناقص تعلیم دے کر اچھا طالب علم بنایا جائے۔

آپ نے آخر ایسی خواتین بھی تو دیکھی ہوں گی جو عمر بھر بھوت یا چڑیل سے خوف کھاتی رہتی ہیں۔ اب آپ ان کو لاکھ سمجھائیے کہ بانی یہ سب آپ کا وہم ہے۔ بھلا ایسی چیزیں بھی کہیں دنیا میں ہوتی ہیں اور پھر طرح طرح سے آپ ان کو مطمئن کریں۔ لیکن انھیں آپ کی بات کا اعتبار کہاں؟ بالفرض وہ مطمئن ہو بھی جائیں تو ان کے دل میں ایک خوف اور جھجک تو باقی رہ ہی جائے گی اور بہت جلد وہ آپ کی سمجھائی ہوئی ساری باتوں کو بھول جائیں گی۔ اب پھر اگر آپ ان کو ٹوکیں گی کہ یہ کیا بُز دلی ہے؟ جب آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ بھوت اور چڑیل کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر یہ خوف یا ڈر کس چیز کا؟ وہ کہیں گی، میں کیا بتاؤں؟ یہ کمزوری مجھ میں بچپن سے ہے اور میں اس پر قابو نہیں پاسکتی۔

ایسے ہی میرے ایک دوست ہیں جو اپنی تینوں بہنوں میں اکیلے چھوٹے بھائی ہیں۔ گو وہ اب ایک بچی کے باپ بھی ہیں لیکن اس قدر تنگ مزاج ہیں کہ بات بات پر بچوں کی طرح رُوٹھ جانا اور رُونی صورت بنالینا ان کی عادت ہے اور پھر یہ بھی کہ ایسی حالت میں کوئی انھیں اس طرح منانے جیسے چھوٹے بچوں کو چکارا جاتا ہے۔ میں نے ایک دن ان

کے سامنے ان کی اس کمزوری کو کھول کر رکھا اور ان کو اچھی طرح سمجھایا کہ جناب! یہ تو کوئی خوبی نہیں ہے۔ وہ بے چارے پوری طرح قائل بھی ہو گئے اور اپنی بات پر شرمندہ بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے جو بات کہی ہے وہ بھی سن لیجیے: نہ معلوم کیوں میں اپنی اس کمزوری سے اچھی طرح واقف ہوں پھر بھی وقت پر اپنے کو قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ لیجیے اب تو آپ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ باتیں جو بالکل ابتدائی عمر میں بچے کے ذہن میں بٹھادی جاتی ہیں ساری عمر باقی رہتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کو دور نہیں کیا جاسکتا لیکن آپ خود سوچیے، کون سی صورت آسان ہے؟ ایک پودے کو اکھاڑ پھینکنا آسان ہے یا ایک بیٹر کو؟

صالح تعلیم کے سلسلے میں جو بات مجھے خاص طور پر پیش کرنی ہے وہ یہ ہے کہ بچے کو "مت کرو" اور "نہ کرو" کے بجائے زیادہ تر "یہ کرو" اور "یہ کرو" کی ہدایت دیں کیونکہ جب بچے کو کسی کام سے باز رکھا جاتا ہے تو فوراً اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ "کیوں نہ کروں؟" پھر یہ چیز اس کو اکثر فلطراہ پر ڈال دیتی ہے۔ بعض اوقات اس کا دماغ اس کو اس طرف موڑ دیتا ہے کہ "ذرا لاؤ اس کو کر کے تو دیکھوں یہ بُرا کیوں ہے؟ اس سے منع کیوں کیا گیا ہے؟" لیکن جب بچے کو صالح خیالات کی طرف ہی متوجہ رکھا جاتا ہے، اور اس کو صالح عمل ہی کرنے کی ہدایت دی جاتی رہتی ہے تو کیوں؟ کا سوال بالعموم نہیں ابھرتا اور بچہ بھٹکنے سے بچ جاتا ہے۔

بچوں کی صالح تعلیم کے لیے پہلے سے بڑی تیاری اور اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے بچے کے مزاج سے پوری طرح واقفیت بے حد ضروری ہے۔ پہلے ہم اس بارے میں ہی کسی قدر تفصیل سے عرض کریں گے، پھر تعلیم کے دلچسپ طریقے پیش کریں گے۔

## بچوں کی خصلتیں

بچہ خواہ کسی عمر کا ہو اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو وہ آپ کو کچھ نہ کچھ کرتا ہوا

نظر آئے گا۔ اگر وہ چند ماہ کا ہے تو اپنے ہاتھ پیروں کو ادھر ادھر پھینکتا ہے گا، ادھر ادھر کروٹیں لیتا رہے گا، یا پھر اپنے ہاتھ یا پیر کے انگوٹھے کو چوستا رہے گا۔ اگر آٹھ دس ماہ کا بچہ ہو گا تو کھسک کھسک کر چلنے کی کوشش کرے گا، مختلف چیزوں کو اٹھانے کی کوشش کرے گا اور منہ تک لے جانے کی کوشش کرے گا۔ سال ڈیڑھ سال کا بچہ کھڑا ہونے اور ایک پلنگ سے دوسرے پلنگ پر جانے، نیچے سے اوپر چڑھنے یا اوپر سے نیچے اترنے کی کوشش کرے گا۔ اور اسی طرح ان سے بڑی عمروں کے بچے بھی کسی نہ کسی مشغلے میں اپنے آپ کو الجھائے رکھنے کی کوشش کریں گے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس امر کو ذہن نشین کر لینے کے بعد بچے کی بہت سی حرکات و سکنات بے معنی اور فضول من لگیں گی بلکہ ہم اس کے معاملے میں زیادہ روادار اور کشادہ دل ہو جائیں گے۔

بچے میں بھی اللہ تعالیٰ نے ویسی ہی قوت اور توانائی رکھی ہے جیسی اس نے آپ میں رکھی ہے۔ لیکن آپ تو اپنی قوت و توانائی کو مختلف ضروری کاموں میں صرف کر لیتی ہیں اور بچے، جو دنیا کے بارے میں ابھی بالکل ہی نا تجربہ کار ہوتا ہے، وہ اس قوت و توانائی کو کہاں خرچ کرے؟ چنانچہ جب تک وہ اس عمر تک نہیں پہنچتا کہ وہ بھی تمام مسائل پر سنجیدگی سے غور کر کے عمل کر سکے وہ اپنے بے مقصد افعال کے ذریعے ہی اس قوت و توانائی کو استعمال میں لایا کرتا ہے۔ اوہ! بے مقصد افعال سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ واقعی وہ بے مقصد افعال کرتا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ افعال ہم کو آپ کو ہی بے مقصد نظر آتے ہیں، ورنہ اس کے لیے یہ بڑے ہی معنی خیز اور اہم ہوتے ہیں، وہ انہیں کسی نہ کسی ضرورت ہی کے تحت عمل میں لاتا ہے۔ مثلاً اسے کسی چیز کو اٹھانا ہے، کسی چیز کو منہ میں رکھ کر اس کا ذائقہ چکھنا ہے یا اور کوئی کام!

بچہ اپنی قوت و توانائی کو زیادہ سے زیادہ کھیل کے ذریعے صرف کرتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی سالوں میں تو وہ ہر چیز کو کھیل ہی سمجھتا ہے۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا کام جو وہ انجام دے جائے، خواہ دوسروں کی نظر میں کتنا ہی اہم ہو، اگر اس نے اسے خوش دلی کے ساتھ کیا ہے تو وہ اس کے لیے کھیل کی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ اس کے ذریعے وہ بہت کچھ سیکھ

جاتا ہے۔ مثلاً چند ماہ کے بچے ہی کو لیجیے، وہ اپنے ہاتھ پیر محض اپنا دل خوش کرنے کے لیے چلاتا رہتا ہے۔ کبھی وہ انھیں ہوا میں اُچھالتا ہے، کبھی بستر پر پٹختا ہے اور کبھی کسی طرف پھینکتا ہے کبھی کسی طرف! لیکن اس کا یہ عمل اس کو بڑی حد تک ہاتھ پیروں کو صحیح نشانے پر معمولی سی کوشش سے پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح اس کے لیے اپنی جگہ سے ہٹ کر کچھ دور چلنا، چیزوں کو چٹسکی سے اٹھانا اور انھیں منہ تک لے جانا، اسے چلنے، چیزوں کو رکھنے، اٹھانے اور استعمال کے بارے میں سکھاتا ہے۔ غرض بچوں کے تمام وہ افعال جو بظاہر ان کے کھیل ہوتے ہیں قدرت کی طرف سے اُن کے سیکھنے اور مشق کرنے کا ذریعہ ہیں۔

بچوں کے ایسے کھیلوں میں جن میں وہ خوشی محسوس کریں، کسی طرح کی بھی رکاوٹ ڈالنا اچھا نہیں۔ آپ خود غور کیجیے کہ جب ڈیڑھ سال کا بچہ بڑی کوشش کے بعد کسی پلنگ پر چڑھ جاتا ہے تو وہ کتنے زوروں سے کلکاریاں مارتا ہے، یا جب وہ کسی ڈبے کے ڈھکن کو ڈبے پر بند کرنا چاہتا ہے اور بڑی محنت کے بعد کامیاب ہو جاتا ہے تو خوشی میں کیسا اچھل اچھل کر ڈبے کو اپنی اٹھیلی سے پیٹتا ہے یا پھر اس بچے کو دیکھیے جو بہت سی اینٹوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیتا ہے۔ پھر ایک طرف سے ایک اینٹ کو گرا دیتا ہے اور تمام اینٹیں گرتی چلی جاتی ہیں اور یوں اس کی ریل ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پر پہنچ جاتی ہے تو وہ کتنا خوش ہو کر تالی بجاتا ہے۔

اس طرح کے کھیل بچے کو ایسے مسئلوں کے بارے میں کھوج لگانے کے لیے آمادہ کرتے رہتے ہیں جن کے بارے میں اس کو کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے اُس کے یہ کھیل اُس کو بہت سی دشواریوں کو خود حل کرنے اور اُن کے بارے میں فیصلہ کرنے پر اُکساتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بچے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ انھیں کی تسکین کے لیے وہ دو سال کی عمر تک اپنی ماں کے ساتھ کھیلا کرتا ہے، بلکہ یہ سمجھے کہ وہ اپنی ماں کو ایسا کھلونا سمجھتا رہتا ہے جو اُس کی بہت سی گتھیوں کو حل کر دیا کرتی ہے لیکن کچھ اور بڑا ہونے پر وہ اپنے باپ کے ساتھ کھل بل کر رہنے کی بھی اچھی خاصی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اس کو باہر

تفریح کے لیے لے جائے۔ نئی نئی چیزیں دکھلائے۔ عجیب عجیب چیزوں کے بارے میں بتائے اور طرح طرح کی کہانیاں سنائے۔ یہ سب کچھ اس کے نزدیک کھیل ہی ہیں۔

کھیل ہی کھیل میں اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جب بچہ کچھ کرنا چاہتا ہے، لیکن نا تجربہ کاری کی بنا پر اُلٹا سیدھا کر جاتا ہے اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے میں ایک بد نظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت وہ خود بھی گھبراتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس نے یہ سب کچھ محض شرارتاً کیا ہے۔

ذرا اس سیدھے سادے سے واقعے ہی کو مثال کے طور پر لے لیجئے کہ آپ کو وہ کئی بار انڈے تلنے، ہونے دیکھ چکا ہے۔ ایک دن اتفاقاً ایک انڈا اس کے ہاتھ لگ جاتا ہے، وہ اس کو لے کر باورچی خانے میں پہنچتا ہے۔ انڈے کو توڑ کر ماہی تُوے میں ڈالتا ہے، پھر مرچ نمک اور جو مسالہ ہاتھ آجاتا ہے بے حساب اس میں ڈالتا ہے۔ اب چُوٹھے کی باری آتی ہے۔ اس میں وہ ڈھیروں لکڑیاں بھرتا ہے۔ ایک ماچس جلاتا ہے اور ٹھکنی سے چُوٹھا پھونکتا ہے، پھر دوسری بار ماچس جلاتا ہے اور پھونکتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری ماچس جلا ڈالتا ہے اور چُوٹھا نہیں جلا پاتا۔ اتنے میں آپ آجاتی ہیں۔ دیکھتی ہیں پورے باورچی خانے میں راکھ دھول کی طرح اڑ رہی ہے۔ آپ گھبرا جاتی ہیں۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ باورچی خانے میں داخل ہوتی ہیں تو دیکھتی ہیں کہ میاں صاحبزادے راکھ میں اُٹے ہوئے بھسندر بنے ہیں اور ماہی تُوے میں بھی نہ معلوم کیا سونات بنا کر رکھ چھوڑی ہے۔ اب دوسری تمام چیزوں کو دیکھتی ہیں تو اس ڈرگت پر اور بھی چپیں بہ جہیں ہوتی ہیں۔ حالاں کہ یہ شرارت نہ تھی بلکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے انڈے تلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اس چُوٹھے نے تمام کھیل بگاڑ دیا۔ اگر چُوٹھا جل جاتا تو شاید وہ انڈا تیل لیتا، لیکن اس کے چُوٹھے نے ایسی بد نظمی پیدا کی کہ تمام بنا بنایا منصوبہ ایک شرارت بن کر رہ گیا۔

اس بد نظمی کی وجہ دراصل یہی تو تھی کہ اُس نے سوچ سمجھ اور دور اندیشی سے کام

نہیں یا، بلکہ نتائج سے بے خبر اور صورت حال کا جائزہ لیے بغیر اس نے اپنی انڈاسٹری کی مہم کو جاری رکھا اور ناکامیاب ہوا۔ اگر بچے کی نگاہ سے دیکھیے تو شرارت ذرا بھی نہیں ہے بلکہ ایک تجربہ ہے اور ہم اُسے ناکامی کی وجہ سے لائق مذمت سمجھتے ہیں اور ناراض ہو جاتے ہیں۔ ان ناکام تجربات کے معاملے میں اگر احتیاط نہ برتی جائے تو وہ یقیناً شرارت بن جاتے ہیں۔

ایک معصوم بچہ شیشہ کا گلاس پلنگ سے نیچے فرش پر پھینک دیتا ہے، گلاس ٹوٹ جاتا ہے اور آپ چیخ پڑتی ہیں: "شریر کہیں کا!" وہ اپنے چینی کے کھلونے کو زمین پر گیند کی طرح پھینکتا ہے اور آپ بگڑ کر کہتی ہیں: "شریر کہیں کا!" غرض اس طرح جب وہ دن میں کئی بار ایسے فقرے سنتا ہے تو شرارت کو اپنا معمول سمجھ لیتا ہے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ کوئی نازیبا حرکت کرتا ہے، دوسرے بچے اس کی اصلاح کرنے کے اس کی نازیبا حرکتوں میں دل چسپی لینے لگتے ہیں تو وہ اس سے بڑھ کر حرکتیں کرتا ہے تاکہ دوسروں کو خوش کر سکے اور یوں اس کی چھوٹی چھوٹی حرکتیں بڑھ کر بہو ہو گئیں بن جاتی ہیں۔ شرارتوں کے سلسلے میں کرنا تو یہ چاہیے کہ جب بچہ تہذیب و اخلاق کی حدود سے گزرنے لگے تو اس کی شوخی کی روک تھام کی جائے نہ کہ اس کو اور شہ دی جائے یا صرف نظر کیا جائے۔ بد کو اس طرح کی حرکتیں ناگوار گزریں گی اور آپ کو پچھتاوا ہو گا۔ بد تہذیب اور بد اخلاق بچہ کسی کو بھی پیارا نہیں ہوتا۔

بد تہذیبی اور بد اخلاقی کی روک تھام اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس کی تیزی اور شوخی کو اچھے کاموں کی طرف موڑ دیا جائے۔ اسے اتنی فرصت نہ دی جائے کہ وہ بیکار بیٹھ کر سوچے، لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ اس کو نئے تجربے کرنے سے ہی روک دیا جائے۔ ایسے وقت جب بچے کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو اسے نئی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے شوق دلایا جائے۔ اس کی خصلت یوں اپنے اظہار کا پورا موقع پا جائے گی۔

ڈانٹ ڈپٹ کر بچوں کو شرارت سے منع کر دینا اچھا نہیں، یہ روش بچے کی صحت پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ آپ نے بار بار دیکھا ہو گا کہ کمزور اور لاغر بچے شرارت نہیں کرتے اور تندرست



اور تو انابچے شرارت کرنے کے لیے ہر وقت ہی تیار رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شرارت بچے کی قوت فکر کا پیمانہ ہے یعنی بوجہ شرارت کرے گا وہ یقیناً اپنے اندر اتنی ذہانت رکھتا ہوگا کہ نئی نئی شرارتوں کے بارے میں سوچ سکے۔ وہ بچہ شرارت کیا کر سکے گا جو اپنی طرف سے کوئی بات نہ کر سکے۔ اس لیے ہمیں اس ذہانت سے بہترین فائدہ اٹھانا چاہیے۔

کھیل کود ہی میں اکثر ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں جب رنگ میں بھنگ پڑ جاتا ہے اور گھل مل کر کھیلنے والے دو بچے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک بچے کے ہاتھ میں کوئی چیز ہوتی ہے۔ دوسرا بچہ آکر اس کو چھین لیتا ہے اور کسی نئے مصرف میں لے آتا ہے۔ فرض کیجیے وہ کاغذ کا ایک تھیلا ہے اور دوسرے بچے نے ٹوپی کی طرح اپنے سر پر اُسے اوڑھ لیا ہے۔ اب پہلا بچہ دوبارہ اپنا تھیلا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا بچہ نہیں دیتا۔ پہلا بچہ جھنجھلا کر دوسرے کو پیٹ دیتا ہے۔ دوسرا بچہ بھی اپنے ہاتھ کی قوت کا مظاہرہ کر ڈالتا ہے۔ پھر دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور رونے چیخنے کی آوازیں اٹھنے لگتی ہیں۔ اس طرح کی وارداتیں سات آٹھ سال تک کی عمر کے بچوں میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ دراصل بچے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لیے قوت و توانائی دے رکھی ہے، یہ نہیں جانتا کہ اس عطیہ خداوندی کو کس طرح استعمال کرے۔ وہ تو اُسے موقع بے موقع استعمال کر ڈالتا ہے۔ پھر آگے چل کر جب اپنے بزرگوں کی طرف سے اس کو رہنمائی نہیں ملتی تو وہ راہ چلتے بچوں کو چھیڑ دینا، انہیں پیٹ دینا یا گالیاں دے دینا ایک معمولی سی بات سمجھنے لگتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب بچہ بگڑ چکا ہوتا ہے۔ ان تمام احتیاطوں کا پہلے سے ہی خیال رکھنا چاہیے تھا۔ بچے کی لڑائی جھگڑے کی خصلت کو ہمیں شروع سے ہی اچھے رخ کی طرف موڑنا چاہیے۔ اولاً بچے کے پاس کھیل کود اور مشغولیت کے لیے اتنا سامان ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے بچوں کی چیزوں کی طرف متوجہ نہ ہو سکے خواہ یہ چیزیں خالی ڈبے، لکڑی، شیشے کے ٹکڑے وغیرہ ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ دوڑ بھاگ کے کھیلوں میں جب بچہ ہتھ لیتا ہے گا تو اس کو اتنا موقع نہ ملے گا کہ اب وہ پھر لڑائی کے لیے موقع تلاش کرے۔ کیوں کہ فٹ بال، ہاکی، کبڈی اور کشتی وغیرہ میں اُس کی یہ قوت و توانائی پہلے ہی استعمال ہو چکی

ہوگی۔ اسی وجہ سے آپ دیکھتی ہوں گی کہ جو بچے ایسے کھیلوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ بڑے ہی خوش طبع اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ گایاں بکنے والے، چڑ جانے والے اور شکست کھا کر رو دینے اور تھوک دینے والے بچے وہی ہوتے ہیں جن میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ دوسرے کا مقابلہ کر سکیں۔ ایسے بچوں کے لیے تو مناسب یہی ہوگا کہ ان کی صحت کی فکر کی جائے۔

میں نے ایک صاحب کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ لڑائی جھگڑے ختم کر اتے دیکھا ہے، اور مجھے ان کا یہ طریقہ بے انتہا پسند ہے۔ جب بھی دو بچے ان کے سامنے آپس میں اُلجھ گئے ہیں تو پہلے انہوں نے یہ کیا کہ دونوں کو الگ کیا اور پھر کہا:

”اس طرح نہیں، تم دونوں کشتی لڑو، پھر جو جیت جلتے وہ جیتا۔“

اس طرح وہ دونوں بچوں کو اپنے سامنے لڑاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغض و عناد تو ختم ہو چکتا ہے، زور آزمائی کا ایک کھیل البتہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمیں بھی چاہیے کہ جب دو بچے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی فکر کر رہے ہوں تو ہم ان کی حسرت بھی پوری کر دیں اور بات بھی نہ بگڑانے دیں۔ بچوں کا ایک عام کھیل یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی نقل اتاریں۔ یہ گڑیوں کے کھیل اور پھر اس میں کسی کا ڈاکٹر بننا، کسی کا باپ بننا، کسی کا استاد بننا، یہ سب نقل ہی تو ہے۔ وہ جب لکڑی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لیتا ہے اور سب کے منہ میں لگاتا پھرتا ہے اور کہتا ہے: ”میں ڈاکٹر ہوں“ تو وہ اپنے سے کسی بڑے کو دیکھ کر ہی ایسا کرتا ہے، اور ایسے ہی دوسرے افعال اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے سے بڑوں کی نقل اتارنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ بعض اوقات اس کی نقلیں ہمارے لیے بڑی دل چسپی کا باعث ہوتی ہیں اور ہم اس سے اس طرح کی مزید حرکتوں کا تقاضا کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب وہ غول غاں کرنے لگتا ہے، چار پانچ ماہ کی عمر میں انگلیوں سے اشارے کرنے لگتا ہے۔ چھ سات ماہ کی عمر میں دوسروں کو دیکھ کر خود بھی سر پر سلام کی غرض سے ہاتھ رکھنے لگتا ہے، اور دوسروں کی نقل میں ویسی ہی آوازیں نکالنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جیسے دوسرے نکالتے ہیں تو وہ اپنی اس خصلت سے اپنی آئندہ زندگی کے

یہ بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔

غور کیجئے تو اس معمولی سی خصلت میں اللہ تعالیٰ نے بچے کے لیے کتنے بڑے بڑے ناندے چھپا رکھے ہیں۔ اپنی ذمہ دارانہ زندگی کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ نقاتی کے کھیلوں کے ذریعے کتنے ہی سنجیدہ کام کر چکا ہوتا ہے۔ مثلاً چھوٹی بچوں کو دیکھیے جو گڑیوں کے کھیل ہی کے ذریعے سینا پر ونا، کپڑوں کو تراشنا اور کھانا پکانا سیکھ لیتی ہیں، اپنے بڑوں کو گھرداری کے کام میں مصروف دیکھ کر وہ اپنے گڑیوں کے کھیل میں بھی اسی طرح مصروف ہونے کی نقل کرتے ہیں۔

آپ نے اکثر چھوٹے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ جس طرح ان کے ماں باپ گفتگو کرتے ہیں، جس طرح وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اور جس طرح اور جس انداز سے پہنتے اوڑھتے ہیں، اسی انداز سے وہ بھی کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح بغیر سوچے سمجھے نقل کرنے میں اور کامیاب ہو جانے میں ان کو بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے، اور یہ مسرت ہی ان کے لیے ایک شش کا باعث اور کھیل کا کامان ہوتی ہے۔

بچے عام طور سے اپنے سے بڑوں کی نقل کرتے ہیں، مثلاً ماں باپ، دادا، دادی بڑے بھائی اور بہن وغیرہ۔ یا پھر ان لوگوں کی بھی نقل اُتارتے ہیں جو ان کی نظر میں عزت کے لائق ہوں یا ان سے کسی بات میں برتر ہوں، تاکہ وہ خود بھی ویسے ہی بن سکیں۔ یہاں مجھے ایک قرآنی آیت رُہ رُہ کر یاد آرہی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (والتین)

ہم نے انسان کی بہترین صورت گری کی۔

اس صفت کی وجہ سے ہی اول روز سے انسان اپنے اندر اچھے سے اچھا بننے کی خواہش رکھتا ہے۔ بچے کی اس خصلت سے آپ کو اس صداقت کا اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ اس کی فطرت بنیادی طور پر صالح ہوتی ہے۔ اس لیے ہماری توجہ اس طرف ہونی چاہیے کہ ہم اس سے اچھے سے اچھا کام لینے کی کوشش کریں۔ اس کے ارد گرد ایسا ماحول بنائیں کہ کوئی نقل کرنے کی خواہش ہو تو وہ اپنے سامنے اچھی ہی چیز نقل کے لیے پائے، لیکن اگر اس کو

گھٹیا قسم کے لوگوں میں ڈال دیا گیا تو پھر وہ اُن جیسا ہی بننے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ایک بچے کو دیکھا جو درجہ ہفتم تک تعلیم پانے کے بعد اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ مجبوراً وہ گھر پر رہنے لگا اور وہاں جاہلوں کے درمیان پڑ گیا۔ اُن کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے وہ اُن سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان ہی کی طرح انتہائی بھدی اور بھونڈی زبان بولنے لگا اور اس کے طور طریقے بھی ویسے ہی ہو گئے۔

اس خصلت کو نہ تو بڑی ہی سمجھ کر لڑکے سے چھڑانا چاہیے اور نہ اس کو طفلانہ حرکت سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔

بچوں میں تقلید کا مادہ کافی ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گی کہ بہت سے کام وہ اپنے بڑوں کے کہنے کے مطابق کرتے ہیں۔ وہ بے چارے اپنے اندر اس عمر میں اتنی ذہنی پختگی نہیں رکھتے کہ تمام کام اپنی ہی قوتِ فیصلہ کے مطابق کر سکیں، اس لیے وہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

ان سے پوچھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انہوں نے صابن سے اس لیے منہ دھویا کہ اُن کی امی نے بھی ایسا ہی کیا تھا، یا وہ درجہ میں بیٹھ کر کیوں باتیں کرنے لگتے ہیں؟ تو وہ کہیں گے کہ اُن کے ماسٹر صاحب بھی تو ایسا ہی کر لیا کرتے ہیں؟ یا پھر یہ کہ وہ پان کیوں کھانا چاہتے ہیں؟ وہ سگریٹ کیوں پینا چاہتے ہیں؟ یا پھر وہ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ وہ پابندی سے صبح کیوں نہیں اُٹھتے؟ تو وہ فوراً یہی جواب دیں گے کہ اُن کے فلاں بزرگ بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔

دراصل اس خصلت سے تو اللہ تعالیٰ بچے کو یہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے سے بڑوں کی رہنمائی میں زندگی کے دشوار گزار راستے کو طے کر سکے، لیکن اکثر بڑے اس بے چارے کو اٹا اور دشواریوں میں ڈال دیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے لیے تقلید کے قابل ایسے نمونے پیش کریں کہ وہ ایک صالح بندہ بن کر پروان چڑھے نہ کہ باغی بن جائے۔ ہم اس کے سامنے خراب نمونے رکھنے کے بجائے اچھے نمونے کیوں نہ رکھیں۔ یہ وہ چند خصلتیں ہیں جن سے ہم کو تقریباً ہر وقت سابقہ پڑتا ہے اور ان ہی کے ذریعے ہم بچے کو سنوار

سکتے ہیں۔

## بچوں کی آزادی

آپ نے بچے کی زندگی میں اس چیز کو اچھی طرح محسوس کیا ہوگا کہ آزادی کو وہ اپنا فطری حق سمجھتا ہے اور اس حق کے حاصل کرنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی ٹکڑ بھی لے لیتا ہے، وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے اس پیدائشی حق سے کسی بھی وقت دست بردار ہو جائے۔ اس کا غصہ اس کی ضد، اس کی شرارت، یہ سب چیزیں کیا ہیں؟ اسی بات کا اظہار تو ہیں کہ وہ اپنی آزادی کو کسی طرح ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی دل چسپیوں میں کوئی دوسرا بھی دخل دے۔

لیکن اکثر گھروں میں میں نے دیکھا ہے کہ بچے کو بالکل نااہل ہی سمجھا جاتا ہے۔ فرض کیجئے وہ تھرما س کھولنا چاہتا ہے جسے ہی وہ ڈھکن کھولنے کی کوشش کرتا ہے اُمی جان کہہ اٹھتی ہیں: ”لا مجھے دے میں کھول دوں، تو کیا کھول پائے گا۔ تجھے تمیز بھی ہے۔“ اب اس کا اثر کیا ہوگا۔؟ یہی ناکہ آئندہ بچہ تھرما س کھولنے کی کوشش نہ کرے گا اور کبھی یہ جسارت کی بھی تو اپنی گھبراہٹ اور نااہلی کے احساس کی وجہ سے توڑ بھی ڈالے گا۔

یہ پابندی آئندہ زندگی میں بڑی مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ اکثر گھرانے ایسے نظر آتے ہیں کہ جہاں مردوں نے سفر کی تیاری کے وقت سامان باندھنے میں کسی کو ہاتھ لگانے نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے یہاں کی عورتوں اور لڑکوں کو اس کا اتفاق ہوا تو وہ بے چارے اپنا سامان سلیقے سے تیار ہی نہ کر سکے۔ بستر بندھا ہے تو وہ بے منگ بکس ہے تو وہ بے ڈھنگ پن سے ٹھنسا ہوا ہے۔ غرض کیا کیے، کیا منظر ہوتا ہے۔ میں تو یہ انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب بچے کو کوئی کام ظاہر کرنا ہی پڑ جائے تو اسے کرنے دینا چاہیے اور کبھی یہ کہہ کر دخل نہ دینا چاہیے کہ ”تو کیا کر پائے گا؟“ جب تک وہ دو چار بار ایک کام کرنے لے گا کیسے کر پائے گا؟ ہاں اس بات کا خیال ضرور رکھیے کہ جب

بچہ اس کام کے کرنے میں کوئی غلطی کرنے لگے تو آپ اس قدر ہدایت ضرور دیں کہ وہ صحیح طریقہ جان جائے پھر اُسے خود ہی کرنے دیجیے۔

لیکن آپ کی یہ مدد کبھی حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ مثلاً بچہ چار پائی پر چڑھتا چاہتا ہے، کوشش پر کوشش کر رہا ہے اور کامیاب نہیں ہو پاتا۔ آپ آتی ہیں اور مارے محبت کے اُسے اُوپر چڑھا دیتی ہیں۔ بھلا اس سے بچے کو کیا فائدہ ہوا؟۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ چار پائی پر چڑھ گیا۔ لیکن اس کو وہ مسرت تو حاصل نہیں ہوئی جو اُسے خود چڑھ جانے میں ہوتی ہے۔ پھر اگر وہ ایک مرتبہ کامیاب ہو جاتا تو انتہائی خوشی کے عالم میں کئی بار اور چڑھنے کی کوشش کرتا، اور یہاں تو آپ نے اپنی محبت میں آکر اس کے آزادانہ مشغلوں میں رکاوٹ ڈال دی۔

اسی طرح یہ رویہ بھی بچوں کی آزادی میں بُری طرح رکاوٹ ڈالتا ہے کہ ایک بچہ چند بے کار چیزوں کے ساتھ کھیل رہا ہو، اور اُن میں وہ اس طرح مگن ہو کہ آپ کی بھی فکر نہ رہے۔ اب آپ پہنچیں اور پہنچتے ہی سوال کریں: "ایں؟ یہ کیا کوڑا کیاڑ تو کھیل رہا ہے؟ کھیلنا ہی ہے تو جا کر اپنے کھلونے لے آ۔ اور اُن سے کھیل۔" مگر اس ہدایت سے پہلے کیا آپ نے خود بھی غور کیا ہے کہ جن چیزوں سے وہ کھیل رہا ہے، وہ اس کے لیے مُضر ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس بے جا مداخلت سے کیا حاصل ہوا؟ سوائے اس کے کہ جس کھیل میں اس کا دل بہلا ہوا تھا اس سے بھی جی اُچٹ گیا۔ اب آئندہ وہ یہی سوچے گا کہ جن چیزوں سے وہ کھیل رہا ہے وہ کھیلنے کے لائق بھی ہیں یا نہیں؟

سب سے زیادہ مُضر بچے کے لیے یہ بڑتاؤ ہے کہ اس کے ساتھ بلاوجہ کی روک ٹوک رُو رکھی جائے۔ یہ مت کر، وہ مت کر! ایسے مت چل، ویسے مت دیکھ! غرض کہ مت، نہیں، ہائیں کے سیکڑوں بم ہوتے ہیں جو قدم قدم پر اس کی راہ میں گرتے رہتے ہیں اور وہ حیران و پریشان رہتا ہے کہ کس کس بم سے بچے اور کس بم کو گرنے نہ دے۔ ایسی پرخطر راہ جس میں ہر قدم پر سیکڑوں خطرے ہوں، بچہ تو بچہ، بوڑھوں

کے بس میں نہیں ہوتا کہ یہ ڈشوار گزار راستے طے کر لیا جائے۔

اگر آپ اس کی راہ میں ان تمام رکاوٹوں میں سے دو ایک بھی کم کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے اس کے حق میں بہت کچھ کر دیا۔ بچہ کبھی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اسے ہر وقت ہی نگو بنا یا جائے۔ وہ تو چاہتا ہے کہ گھر والے اس سے انتہائی محبت کریں، اس کے کسی بھی فعل پر ناک بھوں نہ چڑھائیں اور اسے خوب کھیلنے اور خوش رہنے دیں۔ بس اگر آپ بچے کو یہ احساس دلا سکیں کہ جیسا وہ چاہتا ہے آپ ویسا ہی کر رہی ہیں تو آپ نے اس کی بہت سی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ اب ان ہمدردیوں کا سہارا لے کر آپ اس کی بد عنوانیوں اور خامیوں کو بڑی آسانی سے دور کر سکتی ہیں۔

مثلاً بچہ کھیلنا چاہتا ہے۔ آپ پہلے یہ دیکھیں کہ وہ وقت اور وہ کھیل اس کے لیے مناسب بھی ہے یا نہیں۔ اگر مناسب ہے تو شوق سے کھیلنے دیں ورنہ آپ اس کے لیے ایسے کھیل بھی فراہم کر سکتی ہیں جو اس کو کچھ دیر کے لیے پڑھائی میں لگائے رکھیں یا کام کرنے میں مشغول کر سکیں۔ مثلاً بیت بازی، چمکے، پہیلیاں، تعلیمی کھیل وغیرہ۔ یا پھر یہ کہ ”دیکھیں بھئی تم کو یہ بھی معلوم ہے یا نہیں کہ شکر کہاں رکھی ہے؟ ذرا لے تو آؤ، منیں تمہارے واسطے چلتے بناؤں۔“

اب شاید آپ سمجھ گئی ہوں کہ آزادی سے میری مراد کیا ہے؟ یہی کہ بچہ ہر کام کو یہ سمجھ کر ہی کرے کہ وہ اپنی مرضی سے کر رہا ہے، نہ کوئی زبردستی اس سے کر رہا ہے اور نہ کوئی ہر وقت اس پر مسلط رہتا ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنے کھیلوں میں جی بھی نہ بہلا سکے۔ اس انداز سے آزادانہ زندگی گزارنے والے بچے صرف ذہین ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں یہ صفت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خوش مزاجی اور خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے رہیں۔ آئندہ تعلیم کے ساتھ یہی برتاؤ بے انتہا مفید ہوتا ہے اور بچہ بلند حوصلے کے ساتھ منزل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

## بچوں کے کھیل

ہر جگہ کھیل کا تذکرہ دیکھ کر اور پھر اس کے لیے پُر زور سفارش سن کر تو آپ کے دل

میں یہ سوال ضرور اٹھنے لگا ہوگا کہ آخر یہ کھیل ہیں کیا؟ ان سے بچے سیکھ کیا پاتے ہوں گے۔ ہم نے تو آج تک یہی سنا تھا کہ کھیل بچوں کو خراب کرتا ہے اور اب یہاں اس کے بالکل برعکس سننے میں آ رہا ہے۔ بس اسی الجھن کو دور کرنے کے لیے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بچے کھیلنے کیوں ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اتنی قوت اور توانائی عطا فرمائی ہے کہ وہ زندگی میں پیش آنے والے تمام مراحل میں اپنے اعضائے جسمانی سے کام لے۔ یہ صبح سے لے کر شام تک اور مہینوں سے لے کر سالوں تک جتنے کام وہ کرتا رہتا ہے اُن کے لیے اُس کو کافی قوت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت اس دن اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کرتا جب اس کی ضرورت ہو، بلکہ جس دن بچہ پیدا ہوتا ہے اس دن سے ہی اس کے اندر قوت و توانائی کا دافر تزانہ رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک عام انسان تو اپنی ذمہ داریوں اور مصروفیات کی وجہ سے اپنی اس قوت و توانائی کو استعمال بھی کرتا رہتا ہے جو اس کو عطا کی گئی ہے اور بچے پر کسی طرح کی ذمہ داری اور مصروفیت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی قوت و توانائی کسی مُصرف میں نہیں آتی۔ اب یہ قوت و توانائی اس کے اندریوں ہی بیکار تو نہ پڑی رہے گی بچہ اُسے کسی نہ کسی طرح استعمال کرنے کی کوشش کرے گا چنانچہ جب وہ بستر پر پڑا ہوتا ہے تو اپنے ہاتھ پیر، ہی ادھر ادھر پھینکتا رہتا ہے، جب کچھ اور بڑا ہوتا ہے تو ادھر ادھر بھاگتا دوڑتا ہے یا پھر بے مقصد چیزوں کو رکھتا اٹھاتا ہے یا توڑتا پھوڑتا ہے۔

حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ابھی ابھی مدرسہ (اسکول) سے تھکا ماندہ آ رہا ہے اور ابھی دوسرے بچے نے آواز دی کہ آؤ کرکٹ کھیلیں اور وہ بے انتہا تھکا ہونے کے باوجود کھیلنے چلا جاتا ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ تو اپنی زائد قوت و توانائی کو پڑھنے لکھنے میں صرف کر ہی چکا، اب یہ کہاں سے عود کر آئی؟ جب ہم اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کھیل صرف زائد قوت و توانائی کا خرچ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ دماغی اور جسمانی ٹھکن کے بعد ذرا تھوڑی دیر کے لیے تفریح سے لطف اٹھانا بھی ہے اس کا آپ نے بھی اپنی زندگی میں تجربہ کیا ہوگا۔



جب آپ کچھ دیر کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں گی تو کسی ایسی دل چسپی میں کچھ لمحے گزارنا پسند کرتی ہوں گی کہ وہ دماغی اور جسمانی تھکن جو آپ کو اس کے سلسلے میں اٹھانی پڑی ہے دور ہو جائے، اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ پھر آپ نے اپنے گھر کے مردوں کو بھی دیکھا ہوگا کہ کام پر سے آنے کے بعد وہ فوراً ہی تفریح کے لئے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ پہلے سے تھکے ہوتے ہیں اور مزید تھکنے کے لیے چلے گئے۔ مگر غور کیجیے تو ان مثالوں سے آپ صاف طور پر معلوم کر لیں گی کہ جس قسم کی تھکن انھوں نے کام کے سلسلے میں اٹھانی ہے وہ تفریح کے سلسلے میں کیوں پیش نہ آئے گی، پھر بھی یہ کھیل کا تفریح کی خاطر ہی ہونا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اگر صرف کھیل تفریح اور دل چسپی کے لیے ہوتے تو پھر بچے ایک کھیل کھیلنے کے بعد دوسرا کھیل کیوں کھیلنے لگ جاتے؟ ان کا دل ایک کھیل کھیلنے کھیلنے بھر جاتا ہے تو وہ دوسرا کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں؟

اس کا جواب تو میں اس سے پہلے بھی دے چکا ہوں کہ بچے صرف اپنی قوت و توانائی صرف کرنے اور تفریح و لطف اندوزی کے لیے ہی کھیل نہیں کھیلے، اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے زندگی کا وسیع میدان پھیلا دیا ہے۔ جس سے ان کو کامیاب و کامران ہو کر گزرنا ہے۔ انھیں یہ بھی کوشش کرنی ہے کہ وہ کم سے کم ٹھوکریں کھائیں۔ چنانچہ گڑیوں کے کھیل اور خیالی دنیا کی سیر کے ذریعے وہ بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ کھیل کھیل میں اسے زندگی کے بہت سے تجربے ہو جاتے ہیں۔

ایک بچی جب گڑیوں کا گھر وندا بناتی ہے، اس کے کپڑے سستی ہے، اس کے لیے کھانا تیار کرتی ہے، اس کا بیاہ رچاتی ہے اور ایک بچہ جب ڈاکٹر بنتا ہے، مزدور بنتا ہے، ابو جان بنتا ہے اور ایسے ہی دوسرے سوانگ رچاتا ہے تو زندگی میں پیش آنے والے کتنے ہی فرائض ہوتے ہیں جن کا وہ پہلے ہی سوانگ بھر چکا ہوتا ہے اور پھر آگے چل کر وہ ان سے کتنی مدد لیتا ہے؟ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتی ہیں۔ کتنی ہی بچیاں ہوتی ہیں جو کھیل ہی کھیل میں گھرداری کے متعدد کام سیکھنا شروع کر دیتی ہیں اور بچپن میں گڑیوں کی مسگھر ماں بننے کے بعد وہ بڑی ہو کر ایک سلیقہ مند خاتون بن جاتی ہیں۔

غرض اس طرح آپ محسوس کر سکتی ہیں کہ بچوں کے کھیل، تفریح اور زائد قوت و توانائی کے استعمال کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی آئندہ زندگی کے لیے پہلے سے تیاری کر رکھنے کا ذریعہ بھی ہیں۔  
اب آپ بچے کی پیدائش کے دن سے لے کر اس کی ابتدائی عمر تک کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ وہ کیا کرتا ہے۔؟

جیسے ہی بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پیر ہلا سکے اُس کے کھیل کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا ادھر ادھر ہاتھ پیر پھینکنا، کروٹیں لینا، انگوٹھے کو منھ میں لینا، پیر کے چوسنے کی کوشش کرنا، آخر یہ سب ہے کیا؟ کھیل ہی تو ہے اور اس کھیل کے ذریعے ہی وہ اپنے جسم کے اکثر حصوں سے واقف ہو جاتا ہے، اُن کا استعمال جان جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس کے لیے کسی طرح کا بھی کوئی کھلونا کارآمد نہیں ہوتا، وہ اس طرف توجہ نہیں دیتا۔ ہاں جب وہ تین چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو ایسی چیزوں کو ضرور پسند کرنے لگتا ہے جن کو وہ منھ میں رکھ سکے یا اپنے ہاتھوں سے باسانی اٹھا سکے۔ اس وقت پلاسٹک کے ایسے کھلونے دینا مناسب ہوگا جو ربر یا اسپنج کی طرح گداز اور ملائم ہوں۔ پانچ چھ ماہ کی عمر میں وہ کھلونا نہ صرف منھ میں رکھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اب تو وہ ایسے کھلونے چاہتا ہے جن سے آواز بھی نکل سکے، مثلاً بھنجنے اور بجنے بولنے والے کھلونے وغیرہ جب وہ ان کھلونوں کو ہلاتا ہے اور اُن سے آواز نکلتی ہے تو وہ بے حد خوش ہوتا ہے۔ اس عمر میں اس کا ایک پسندیدہ کھیل یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے منھ سے طرح طرح کی آوازیں نکالے اور اُن کو سن کر خوش ہو۔ اس طرح وہ اپنی آواز کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔  
آٹھ نو ماہ کی عمر تک جب وہ اٹھنے بیٹھنے لگتا ہے، یا پھر اپنی جگہ سے کھسکنے لگتا ہے تو اس کی حرکتوں میں اور اس کے کھیلوں کے انداز میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ خود چیزوں کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب کوئی چیز پسند نہیں آتی ہے تو اُس کی طرف سے رُخ پھیر لینے کے بجائے اُسے پھینک دیا کرتا ہے۔ چھوٹی موٹی چیزوں کو اٹھا کر منھ میں رکھ لیا کرتا ہے۔ ڈبے اور بکس کھولنے کی بھی کوشش کرتا ہے اور ایسے کھولنے بند کرنے والے کھیلوں میں اس کو بڑی دل چسپی ہوتی ہے، خواہ اس کی انگلیاں ہی

کیوں نہ کسی چیز میں پھنس جائیں۔

پھر جب بچے چلنے پھرنے کے لائق ہو جاتا ہے تو وہ ایسے کھلونوں کو پسند کرتا ہے جن کے سہارے وہ چل سکے یا جن کی ڈوریاں وغیرہ کھینچ کر چلا سکے۔ سال دو سال کے بعد وہ کھلونوں ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ اب وہ رنگین تصویروں اور کتابوں میں بھی دلچسپی لینے لگتا ہے۔ نہیں! کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں، صرف اُن کے ورق اُلٹنے پلٹنے، پھاڑنے اور تصویروں کو دیکھنے کے لیے، اُن کو سمجھنے کے لیے، اُن میں معنی تلاش کرنے کے لیے۔ اس عمر میں وہ چھوٹے کھلونے، ریل گاڑی، گرسی، میز، گری یا گڑے وغیرہ بھی پسند کرتا ہے۔ تین چار سال کی عمر میں وہ اکیلا آزادانہ طور پر کھیلنا پسند کرتا ہے۔ یہ دور وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے کھلونوں کو اُلٹ پلٹ کر، یا کچھ دیر تک کرا نہیں غور سے دیکھ کر اپنے پچھلے کھیلوں کو کھیل کر جو کچھ سیکھا، ہوتا ہے اس میں بچگی و مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا۔

اس عمر سے گزرنے کے بعد وہ دوسرے بچوں کے ساتھ گھل مل کر ہی کھیلنا پسند کرتا ہے۔ اب وہ ان کے ساتھ گھروندے بناتا، ابو جان بنتا اور دوسرے سوانگ رچا کر کھیلتا رہتا ہے۔ اکیلے کھیلتے ہوئے اب وہ اکتانے لگتا ہے اور اکیلا وہ کھیل بھی کیا سکتا ہے۔ ہر قدم پر دوسرے ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بھلا اکیلا قاضی بن کر وہ کس کے مقدمے کا فیصلہ کرے گا؟ یا اکیلا استاد بن کر کون بچوں کو پڑھائے گا؟ یا اکیلا اپنے خیالی بازار جا کر کس سے سودا خریدے گا؟ چار پانچ سال کی عمر تک آپ نے بچے کے کھیلوں کی نوعیت دیکھ لی دیکھی کیسے کیسے عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس کے کھیلوں میں تبدیلی آتی جاتی ہے اور کیسے کیسے یہ کھیل اس کے ان افعال سے مناسبت اختیار کرتے جلتے ہیں جن کو اسے سیکھنا ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی اپنے جسم کے حصوں سے آگاہ ہونا، کبھی بولنے کی کوشش کرنا، کبھی چیزوں کو رکھنے اٹھانے کی کوشش کرنا، کبھی چلنے پھرنے کی کوشش کرنا اور کبھی دوسروں سے گھل

بل کر رہتا۔ اب بتائیے اگر یہ کھیل نہ ہوتے تو بچہ یہ سب کچھ کیوں کر سیکھتا؟ اور وہ بھی اتنی جلد!

دراصل کھیل کے ذریعے بچوں کو کچھ سکھانا زیادہ آسان ہے۔ بہ نسبت یہ احساس دلانے کے کہ وہ کوئی فرض انجام دے رہا ہے کھیل میں بچہ جس قدر دل چسپی لیتا ہے اس قدر وہ کسی اور کام میں نہیں لیتا۔ آپ خود اس بات کو آزما سکتی ہیں۔ ایک چھ سات سال کی بچی کو اپنے پاس بٹھالیجیے اور اس سے کہیے کہ آؤ دیکھیں کون جلدی پلیٹیں دھوتا ہے۔ دیکھیے وہ کتنی پھرتی کے ساتھ اور خوش دلی کے ساتھ آپ سے سبقت لے جانے کوشش کرے گی لیکن پھر فوراً ہی اُس سے یہ کہہ کر اُٹھ جاتیے: یہ سارے برتن تم کو ہی دھونے ہیں اور اب اُس کے چہرے کو ملاحظہ کیجیے، مُر جھپایا ہوا سا، رنجیدہ سا اور غصے یا ناپسندیدگی سے تکتا ہوا، ہوا۔ یہی تو ہوگی اس کے چہرے کی کیفیت!

پھر بتائیے کہ وہی کام جس کو وہ ایک حالت میں پوری دل چسپی کے ساتھ کر سکتی ہے، دوسری حالت میں جبر کے ساتھ کیوں کرایا جائے؟ اسی وجہ سے بچوں کو جو کچھ سکھانا ہے وہ زیادہ تر اُن کو کھیلوں ہی کے ذریعے سکھایا جائے۔

پچھلے صفحات میں میں آپ کو یہ بتا ہی چکا ہوں کہ بچے اپنی ابتدائی عمر میں کیسے کیسے کھیل کھیلتے ہیں۔ اب یہاں میں بچوں کے کھیلوں کے بارے میں بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ عام طور سے ان کے کھیل کس طرح کے ہوتے ہیں۔

بچے عام طور سے چیزوں کو بڑی بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں بھلونوں کو پھینکنا، پٹھنا اور ٹوڑنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ اس طرح وہ مختلف چیزوں کے خواص سے آگاہ ہوتے ہیں۔ انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح کی چیزیں کمزور ہوتی ہیں اور کس طرح کی چیزیں پھینکنے اور پٹھنے سے بھی نہیں ٹوٹتیں!

اس سلسلے میں یہ احتیاط تو ضرور درست ہے کہ بچوں کو ایسے کھلونے فراہم نہ کیے جائیں جو نازک ہوں اور جلد ٹوٹ جائیں، لیکن یہ کسی طرح بھی درست نہ ہوگا کہ جب بچہ کسی کھلونے کو بے دردی سے استعمال کر رہا ہو تو اُسے جبراً روک دیا جائے۔ کیوں کہ اس روک ٹوک

کے بعد وہ اپنے تجربوں کو جاری نہ رکھ سکے گا۔

بچے اکثر بے معنی شور، ہنگامہ، بھاگ دوڑ اور کود پھانڈ بھی پسند کرتے ہیں۔ بظاہر اس طرح کی آوازیں اور یہ بھاگ دوڑ آپ کے لیے بیکار ہوتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس طرح کے کھیلوں میں یہ فائدہ رکھ چھوڑا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پیروں کو اور جسم کے مختلف اعضاء کو چابک دستی کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ ان کو اس طرح کے کھیلوں کے ذریعے اپنے جسم کو پختہ اور چست و چالاک بنانے کا پورا موقع دیں۔

کبھی بچے ریت میں سُرنگیں بناتے ہیں، کبھی مٹی کے کھلونے بناتے ہیں، کبھی لکڑی اور تنکوں سے چھپرے بناتے ہیں، کبھی ریل گاڑی بناتے ہیں، کبھی کچھ کبھی کچھ؛ غرض اس طرح وہ پہلے سے ہی مختلف چیزوں کا بنانا اور ان کا استعمال جان جاتے ہیں۔ آئندہ زندگی کے لیے یہ تعمیری کھیل بڑے ہی مفید ہوتے ہیں۔ بچپن کا انجینئر بڑا ہو کر اچھا خاصا عملی شخص بن جاتا ہے۔ اس طرح کے تعمیری کھیلوں میں اُن کو عام طور سے دوسروں کی مدد کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یوں وہ دوسرے لوگوں سے اپنے کاموں میں مدد لینا بھی سیکھ جاتے ہیں۔

بلی کے بچوں کو تو آپ نے آپس میں کھیلتے دیکھا ہی ہوگا کہ اُن کا کھیل آپس میں لڑنا جھگڑنا ہی ہوتا ہے۔ بچے بھی اکثر کھیل میں لڑتے جھگڑتے ہیں، کبھی وہ فوج کے سپاہی بن کر ایک دوسرے سے جنگ آزما ہوتے ہیں، کبھی پہلوان بن کر ایک دوسرے سے کشتی لڑتے ہیں اور کبھی اسی میں لطف حاصل کرتے ہیں کہ کسی کو گرائیں، دھکا دیں یا کسی اور طرح ہاتھ پائی کریں۔ یہ کھیل انہیں آئندہ زندگی میں آنے والی رکاوٹوں اور مصیبتوں سے سامنا کرنا سکھاتا ہے۔ جو بچہ بچپن میں اس طرح پھڑ جانے سے نہیں گھبراتا وہ آگے چل کر بھی بڑی سخت سے سخت مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے لگے گا۔

ان تمام طرح کے کھیلوں سے مختلف وہ کھیل ہوتے ہیں جو بچے خاموشی سے بیٹھ کر اپنے دماغ کو استعمال کرتے ہوئے کھیلتے ہیں۔ مثلاً پہیلیاں بوجھنا آپ نے دیکھا ہوگا کہ پہیلیاں بوجھنے میں بچے کتنی دل چسپی لیتے ہیں، اور پہیلی بوجھ لینے پر اُن کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔

کہانیاں سننا بھی اُن کا پسندیدہ کھیل ہے۔ غور کیجیے تو آپ دیکھیں گی کہ وہ صرف کہانی سن کر ہی لطف نہیں لیتے ہیں، بلکہ اُسے یاد رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور پھر جیسے لوگوں کے بارے میں وہ ان کہانیوں میں سنتے ہیں ویسا ہی بننے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کھیل سے ایک مسلم خاتون پورا پورا فائدہ اٹھا سکتی ہے کہ وہ بچوں کو صالح اور خدا پرست بندوں کے حالات زندگی سے متعارف کرانے۔

سیت بازی، لفظ بنانا، تعلیمی تاش، بچوں کا کھیل وغیرہ ایسے ہی کھیل ہیں جن سے بچوں کی ذہنی استعداد بڑھتی ہے اور پھر جب یہ کھیل دل چسپ ہوتے ہیں تو بچے اور بھی زیادہ شوق کے ساتھ اپنے دماغ کو کام میں لاتے ہیں۔ انھیں اس کا زیادہ سے زیادہ موقع ملنا چاہیے تاکہ ذہنی لحاظ سے وہ زیادہ سے زیادہ بالغ ہو جائیں۔

بچوں کو کھیل میں ہی راست بازی سکھائی جاسکتی ہے۔ اُن میں عام طور سے یہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ جیت جائیں۔ چنانچہ وہ اکثر ایسا بھی کرتے ہیں کہ کسی چیز کو واقعہ کے خلاف بیان کرتے ہیں۔ ایسے وقت اگر ان کو سمجھا دیا جائے کہ ان کی یہ حرکت اچھی نہیں، اسے جھوٹ کہتے ہیں اور جھوٹ بولنا اچھے بچوں کا کام نہیں ہے۔ اللہ میاں جھوٹ بولنے والے بچوں سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتائیے کہ جھوٹ بولنے سے اُس کا کیا نقصان ہوا اور کیسے ہوا تو وہ آئندہ احتیاط برتنے کی کوشش کریں گے۔

ہارتا ہوا بچہ عام طور سے جھگڑ بھی پڑتا ہے۔ اُسے اگر سمجھا دیا جائے کہ کھیل میں لڑنا تو اچھی بات نہیں۔ اگر وہ اس طرح تمام لڑکوں سے غلط بات پر جھگڑتا رہے گا تو پھر اس کے ساتھ کوئی بھی نہ کھیلے گا اور وہ اکیلا رہ جائے گا۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ اس طرح چند ایک بار سمجھانے کے بعد وہ بڑا متحمل مزاج اور خوش اخلاق بچہ بن جائے گا۔

ایک ایک اچھائی کے فروغ دینے کے بارے میں کہاں تک لکھا جائے؟ اور چند ایک نمونوں سے آپ بہت کچھ خود ہی کر سکیں گی۔

بچوں کے کھیل کے بارے میں ایک توجہ آپ کی طرف سے بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ بچے کو غور سے دیکھیں کہ وہ کہیں اپنے سے کم عمر بچوں کے کھیلوں میں دل چسپی تو نہیں

لے رہا ہے اور وہ کہیں اپنی عمر کے بچوں کے کھیلوں میں شریک ہونے سے جھجکتا تو نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی جسمانی یا دماغی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کی فکر کریں اور توجہ دیں کہ وہ خرابی جو اس میں پیدا ہوگئی ہے دور ہو جائے۔ جسمانی کمزوری تو معالجے ہی کے ذریعے دور ہو سکتی ہے لیکن ذہنی بیماری دور ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کی دل چسپیوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور رفتہ رفتہ اس کو اُن چیزوں میں دل چسپی لینے کے لیے تیار کیا جائے جن سے وہ جھجکتا ہے۔ آج کل ہمارے گھروں میں تفریح کے ایسے ایسے طریقے اور سامان آگئے ہیں کہ بچہ اُن سے غیر محسوس طور پر متاثر ہوتا ہے۔

## ابتدائی تعلیم

کھیل اپنی جگہ پر لاکھ لاکھ اہم سہی، تعلیم تو بہر حال ضروری ہوتی ہے۔ بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے اور آپ کو خود اُس کی تعلیم کی فکر ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے یہ زمانہ جو گذر رہا ہے اس میں تعلیم ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے۔ جاہل انسان نہ صرف مختلف پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ بہت سی محرومیوں کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے آپ کی فکر مندی اپنی جگہ پر درست ہی ہے۔

ہمارا ملک تعلیم کے معاملے میں خاصا پسماندہ ہے۔ تمام بچے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے، کیوں کہ بہت سے منصوبوں کے باوجود لازمی تعلیم کا سلسلہ شروع نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، تعلیم کے جو چند وسیلے ہم کو میسر ہیں۔ یعنی اسکول اور مدرسے۔ ان میں کوئی سوچا سمجھا تعلیمی نصاب اور نظام بھی رائج نہیں کیا گیا ہے۔ اکثر اداروں میں محض روایتی طریقہ تعلیم ہی نافذ ہے، جس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ فواد کے طالب علم اور اُس کے تقاضوں کی طرف سے بالکل نافل ہیں۔ نام کے لیے جو گئے چھنے زمری یا کھنڈر گارٹن تعلیمی ادارے ہیں بڑے بڑے شہروں میں نظر آتے ہیں، ان کی رسم ظریفی یہ ہے کہ وہ جدید طریقہ تعلیم کو ہمارے

ماحول کے مطابق ڈھالنے کے بجائے بچوں کو کورانہ مغربی تقلید کے لیے پروان چڑھاتے ہیں۔ اس طرح تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور نقالی کا رویہ پروان چڑھتا ہے۔ یہ ایک دشواری ہے، جس پر ملکی حالات کی بھوری کی وجہ سے ہمیں عبور حاصل کرنا ہے۔

آج کل ایک روش یہ عام ہوئی ہے کہ گلی گلی کوچے کوچے زمری اسکول، منٹیسوری اسکول اور پبلک اسکول کھل گئے ہیں۔ یہ اسکول کیا ہیں تدریسی دوکانیں ہیں جن کے ذریعے بس زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جاتا ہے۔ نئے نئے ڈھنگ سے اچھی خاصی رقمیں وصول کی جاتی ہیں۔ مثلاً تمام بچوں کو سال کے شروع میں ایک بڑی رقم اسکول کے امدادی فنڈ میں جمع کرنی ہوتی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی جشن یا پروگرام کے لیے چندہ دینا ہوتا ہے۔ کنٹری کارٹن اور زمری کے طالب علموں کو بھی کمپیوٹر کی فیس دینی ہوتی ہے جب کہ وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھتے۔ ان شہروں میں جن میں بجلی کے محکمے کی نااہلی اور بدعنوانی کی وجہ سے کئی کئی گھنٹے بجلی غائب رہتی ہے، جنریٹر کے نام پر ان مہینوں کی بھی فیس وصول کی جاتی ہے جن میں اسکول عملاً بند رہتا ہے۔ ایسی ہی اور بہت سی ترکیبیں ہیں جن کے ذریعے آمدنی بڑھائی جاتی ہے۔ ایک طرف کمانے کا انداز یہ ہے تو دوسری طرف معلمات دو تین سو یا چار پانچ سو روپے ماہانہ پر رکھی جاتی ہیں ان میں سے بیشتر ٹرینڈ نہیں ہوتی ہیں اور بیکار وقت میں کمائی کے لیے اُستانی بن جاتی ہیں۔ ایسا انتظامیہ اور ایسی اُستانیاں بچوں میں کیا دل چسپی لیں گی اور انھیں کیا پڑھائیں گی، ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایسے ادارے چند اشخاص کی طمع تو پوری کر دیتے ہیں لیکن بچوں کا تعلیمی مستقبل تباہ کر دیتے ہیں۔

کم حیثیت گھروں میں سوچنے کا انداز یہ ہے کہ ابھی تو بچہ چھوٹا ہے، ابھی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب بڑا ہوگا تو دیکھا جائے گا اور بڑا کب ہوگا؟ یہ اس کی عمر پر نہیں آپ کے فیصلے پر منحصر ہوتا ہے۔ آپ یہ فیصلہ کب کریں گی یا کریں گے؟ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ آپ اُس کے تعلیمی اخراجات کب برداشت کر سکیں۔ وہ مائیں جو زیادہ سُوجھ بوجھ نہیں رکھتیں بچے کو نام طور سے پڑوس میں کسی خاتون کے پاس بھیج دیتی ہیں جو اس کے ہاتھ میں بغدادی قاعدہ پکڑا کر چار پائی پر بٹھا دیتی ہیں۔ خود گھر کے کاموں میں لگ جاتی ہیں اور بچہ بلند آواز سے



”اب، ت“ کی ہانک لگاتا رہتا ہے۔ کہیں ذرا وہ خاموش ہوا اور اُن خاتون نے وہیں سے لٹکارا: ”اے چُپ کیوں ہو گیا رے۔ سبق کیوں یاد نہیں کرتا؟“ بچہ پھر سہم کر وہی بے معنی سی رٹ لگانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ”اب، ت“ کیا ہوتی ہے؟ اس سے اُس کو فائدہ کیا ہوگا؟ یہ ایسے سوالات ہوتے ہیں جن کے اُس کو جواب نہیں ملتے۔ رفتہ رفتہ وہ ان سوالوں کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے، اور پھر اس غفلت کے ساتھ تعلیم میں اس کی دل چسپی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بس پڑوس کی خاتون کے یہاں گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے اس لیے چلا جاتا ہے کہ اُسے اپنے سر سے ایک بو جھڑا تارنا ہوتا ہے۔ اس طرح تعلیم بچے کے لیے ساری زندگی ایک بو جھڑی رہتی ہے اور جیسے ہی اُسے موقع ملتا ہے، یا اُسے اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکے، وہ تعلیم سے رتیاں ٹڑا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

مدرسوں اور اسکولوں کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ ایک درجے میں بہت سے بچوں کے درمیان ایک اُستاد یا ماسٹر، جو ہر بچے کی طرف خصوصی توجہ نہیں دے سکتا، تمام بچوں کو ایک ہی ڈھڑے سے پڑھاتا رہتا ہے۔ اب بچہ چاہے ذہنی طور پر کمزور ہو یا بے حد ذہین، اُسے اسی طرح اور اتنا ہی کام کرنا ہے جتنا اُستاد چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ کرنے کی ضرورت نہیں، اس سے کم کرنے پر سزا لازمی! نتیجہ یہ کہ ذہین بچہ ٹھٹھ کر رہ جاتا ہے اور کند ذہن بچہ اپنی کمی کو پورا نہیں کر پاتا۔

یہاں ایک مشکل اور سامنے آتی ہے۔ بچہ اسکول یا مدرسے میں زیادہ سے زیادہ چھ یا سات گھنٹے رہتا ہے۔ باقی وقت وہ اپنے گھر پر والدین کے ساتھ، یا اپنے دوستوں اور بھولیوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس عرصے میں وہ کیا کرے۔ کم عمر بچوں کو گھر پر کرنے کے لیے مشقی کام اتنا نہیں دیا جاسکتا کہ وہ باقی سارا خالی وقت اس مصروفیت میں گزار سکیں۔ والدین کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم تو اسکول یا مدرسے میں دی جاتی ہے، اس کے لیے ہم کیوں پریشان ہوں۔ مشقی کام بچے اور اُستاد کی ذمے داری ہے، ہم سے کیا مطلب! اس طرح اسکول اور گھر میں خاصا فاصلہ قائم ہو جاتا ہے، اور بچہ ان دونوں جگہوں کو الگ الگ

دنیا میں تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بچے کی تعلیمی ترقی کے لیے یہ رویہ خاصا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف آج کل کے پبلک اسکولوں میں بچوں کو گھر پر کرنے کے لیے اتنا کام دے دیا جاتا ہے کہ وہ اکیلا کر ہی نہیں سکتا۔ اُس کے والدین یا ٹیوٹر کو اُس کی مدد کرنی پڑتی ہے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بچہ سیکھنے اور خود کرنے کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے اور اُس کی صلاحیتیں کُند پڑ جاتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بچے کو ایک نہ ایک دن مدرسہ یا اسکول جانا ہی ہے۔ اس سے کہاں تک بچا جاسکتا ہے لیکن آپ اتنا تو کر سکتی ہیں کہ اس مرحلے کے لیے بچے کو تیار کریں میرے ذہن میں چند مشورے ہیں۔ آئیے ان پر غور کریں، ممکن ہے ان کے ذریعے بچے کی کچھ مدد ہو سکے۔

ابتدائی تین سال تک بچہ لکھنا پڑھنا نہیں سیکھ سکتا۔ اگر وہ "ا، ب" پہچاننے لگتا ہے تو یہ پڑھنا نہیں ہوتا بلکہ کھیل ہوتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو خوش کرنے کے لیے، آپ کی نقل میں اُس نے ان حروف کو پہچانا شروع کر دیا ہو۔ الفاظ کی ساخت اور ان کی پہچان تو اُس کے لیے مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کے لیے کبھی اُس پر یہ غیر ضروری بوجھ نہ ڈالیے۔

ایک صاحب نے اپنی تین سال کی بچی کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اُسے جدید کھیل کے اسکول میں داخل کریں جہاں ساری تعلیم کھیل کود کے ذریعے دی جاتی ہے، مگر ان کے دینی تقاضے نے اُن کو اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا کہ وہ اُسے قرآن مجید بھی پڑھادیں۔ یہ تعلیم انھوں نے گھر پر دینی مناسب سمجھی۔ بچی کی ماں اُسے لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور بغدادی قاعدہ پڑھاتی تھیں۔ بچی غیر معمولی طور پر ذہین تھی، اس لیے وہ تمام حروف کی تقطیع چند گھنٹوں میں یاد کر گئی۔ لیکن جب اُس سے پوچھا جاتا کہ "ا" کہاں ہے تو کبھی وہ "ص" پر انگلی رکھ دیتی، کبھی "د" پر کبھی "ی" پر، کبھی "ق" پر، کبھی "پھر" پر! غرض صحیح حرف پر انگلی نہ رکھتی۔ سختی یا محبت کوئی حربہ اُس پر کام نہ کرتا۔ یہاں تک کہ کئی مہینے گزر گئے لیکن وہ حروف کی تقطیع سے آگے نہ بڑھ سکی۔ والدین کے لیے یہ ایک اچھا خاصا مسئلہ تھا، جس کا حل اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بچی کو ان حروف سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ کیوں کہ اس کے لیے ان

میں کوئی معنی نہیں تھے۔ اگر ان حروف میں کوئی معنی پیدا کر دیے جائیں اور کھیل کی سی دل چسپی پیدا کر دی جائے تو بچے کے لیے حروف کو پہچاننے کا شوق پیدا ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں کلنڈر، تعلیمی تماش اور حروف کے گنگلے بازار میں بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے آپ بچے میں حروف سے دل چسپی پیدا کرا سکتی ہیں۔ جب بچہ ان سے کھیلنے لگتا ہے تو کھیل ہی کھیل میں حروف بھی پہچاننا شروع کر دیتا ہے۔ جدید تعلیمی طریقے کے ذریعے بچہ تصویروں، کھلونوں اور بچوں کی تعلیمی فلموں کے ذریعے بھی حروف سے مانوس ہو جاتا ہے۔

تین سال کی عمر تک بچے جملے بنانے اور جملوں میں ربط پیدا کرنے میں دل چسپی نہیں لیتا۔ پانچ سال کی عمر تک اس کے لیے تین یا چار الفاظ سے زیادہ کا جملہ ذہن پر بار ہوتا ہے۔ وجہ یا منطق کا لحاظ رکھنا اس کے لیے بے معنی ہوتا ہے۔ اس لیے اس زمانے میں اس سے کتابیں پڑھنے کا تقاضا نہ کیجیے۔ اس کی توجہ تو سننے اور تجربہ کرنے کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے اسے عملی تعلیم دیجیے۔ آپ گھر میں بہت سے کام کرتی ہیں، بہت سی چیزوں کے نام اسے معلوم ہوتے ہیں۔ کونکہ یا کھریا سے زمین پر ہی ہی اس چیز کا نام لکھ دیجیے۔ بکرنہ کیجیے کہ وہ حروف کی تقطیع سے آشنا نہیں ہے۔ یہ الفاظ خود اس کے لیے نشان یا علامت بن جائیں گے بار بار ان ناموں کے لکھے جانے کی وجہ سے وہ ان سے مانوس ہو جائے گا۔ پھر جب وہ بہت سے الفاظ سے واقف ہو جائے تب آپ ہر لفظ کو توڑ توڑ کر بتائیے کہ ان میں کون کون سے حروف ہیں۔ آپ دیکھیں گی کہ ایک حرف بہت سے ناموں یا الفاظ میں آیا ہے۔ بچہ اس کو آسانی سے پہچان لے گا۔ یہ راست طریقہ تعلیم کہلاتا ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی کتابیں اردو میں بل جاتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے اگر آپ اس طریقہ تعلیم کو سیکھ لیں تو بچے کی چسپی ہونی صلاحیتوں کو روشن کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

تعلیم کے سلسلے میں سب سے بڑی دشواری حساب کے معاملے میں پیدا ہوتی ہے۔ عام طور پر ہم آپ کا سب کا یہ غلط خوف ہوتا ہے کہ حساب بہت مشکل مضمون ہے، عام بچہ

اس میں کمزور ہی رہتا ہے۔ ہم اپنے اس خوف کو بچے میں اُس وقت منتقل کر دیتے ہیں جب اُس نے ابھی حساب پڑھنا شروع بھی نہیں کیا ہے۔ یہ ہم آپ سب کا بے بنیاد خوف ہے۔ بچے تو اُس وقت سے حساب سیکھنا شروع کر دیتا ہے جب آپ کو احساس بھی نہیں ہوتا، اور نہ بچے کو اس مضمون کے وجود کا علم ہوتا ہے۔ آپ اُسے ایک روٹی دیتی ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ ایک روٹی کیا ہوتی ہے۔ آپ اُسے پچاس پیسے دیتی ہیں، وہ پچاس پیسے کی ٹانی کھا لیتا ہے۔ آپ اُس سے پوچھتی ہیں ”تمہارے پیسے کیا ہوتے؟“ وہ کہتا ہے: ”پچیس پیسے کی میں نے ٹانی کھالی۔ پچیس پیسے یہ رہے!“ کیا اس کے باوجود اُس کو جوڑ اور گھٹاؤ نہیں آتا؟ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی مڑغیاں کتنی ہیں، اُس کے کھلونے کتنے ہیں، گڑیاں کتنی ہیں، گڈے کتنے، چڑیاں کتنی، موٹریں کتنی، ابو امی کتنے؟ سبھی کچھ تو اُس کو معلوم ہے۔ پھر ہم کیسے کہہ دیں کہ اُسے حساب نہیں آتا، یا حساب اُس کے لیے مشکل ہے۔ بس مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جب اُس کی کاپی پر لکھی ہوئی گنتی میں ہم منتی پیدا نہیں کرتے۔ اگر اس گڑے سے ہم واقف ہو جائیں تو ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔

شروع شروع میں بچے جب اسکول یا مدرسہ جاتا ہے تو اُس کے لیے ایک نئی دُنیا وجود میں آتی ہے۔ مدرسے کا خوف کچھ تو ہم غیر ارادی طور پر اُس کے ذہن میں بٹھا دیتے ہیں، اور کچھ وہ اجنبیت کی وجہ سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ ہم اسکول کے مسئلے کو اس سنجیدگی سے اٹھاتے ہیں اور اس قدر اس کی طرف سے فکر مند ہو جاتے ہیں کہ بچے پو کتا ہو جاتا ہے۔ اُسے یہ خطرہ ستانے لگتا ہے کہ جانے اسکول میں کیا ہو، اور اُس کو کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس خوف کے ساتھ جب وہ اسکول پہنچتا ہے تو اُس کو ایک نئے ماحول سے واسطہ پڑتا ہے، جہاں ابو، امی، بھائی، بہن کے بجائے اجنبی بچے ہوتے ہیں جن سے اُس کا تعارف پہلی مرتبہ ہوتا ہے۔ استاد یا اُستانی بھی اس کے لیے مانوس شخصیت نہیں ہوتی۔ بہت سے بچے اس نئے ماحول سے خائف ہو کر رونا شروع کر دیتے ہیں اور یہ تو بچوں کا مزاج ہوتا ہے کہ ایک کو دیکھ کر

دوسرا بھی رونے لگتا ہے۔ بعض اسکولوں میں تو اس طرح بچوں کے باقاعدہ رونے کا پروگرام ہوتا ہے۔ بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ اُستاد یا اُستائیاں اس پریشان کن معاملے میں بچوں کو تسلی دینے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کے دل میں مستقل طور پر ایک خوف بٹھ جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے تعلیم کی طرف سے بد دل ہو جاتے ہیں۔ بعض والدین بھی اس خوف کو پروان چڑھانے میں خاصا بڑھ چڑھ کر حصہ

لیتے ہیں۔ اکثر صبح کے وقت رکشوں میں جاتے ہوئے یا پیدل کندھوں پر بستہ لٹکائے، بلند آواز سے روتے زبردستی اسکول جاتے ہوئے چھوٹے بچوں کو آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ کیا ایسے بچے اپنے اسکول خوش دلی کے ساتھ پہنچتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر آپ زبردستی ہی سے کام لیں گی تو بچہ بد دل ہو جائے گا اور تعلیم میں دل چسپی لینا پسند نہ کرے گا۔ اگر آپ شوق دلانے اور اسکول جانے کے لیے اُسے خوش دلی سے آمادہ کریں گی تو اسکول کے ماحول سے اُس کا خوف دُور ہو جائے گا۔ اس لیے ہمیشہ اُسے محبت کے ساتھ اور اُس کی ذات میں پوری دل چسپی لے کر اسکول کے لیے رخصت کیجیے۔

پانچ سال کی عمر تک بچہ اسکول میں ہمیشہ اپنے والدین کے ذکر کا موقع نکالتا رہتا ہے، کیوں کہ اس کی توجہ کامرکز اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ ان کو وہ اپنے لیے مثالی ہستیاں تصور کرتا ہے۔ اس عمر کو پہنچنے تک وہ دوسری ہستیوں میں بھی خوبیاں تلاش کرنے لگتا ہے۔ خاص طور سے گھر کے بعد اُس کا براہِ راست تعلق اپنے استادوں اور اُستانیوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے اب وہ اُن کے اعمال اور برتاؤ میں دل چسپی لینے لگتا ہے۔ اپنے والدین کے سامنے بھی وہ اُن کے تذکرے کیا کرتا ہے۔ اس مرحلے پر چند باتوں کا خصوصیت کے ساتھ آپ کو لحاظ رکھنا ہے۔

○ بچے کے سامنے اپنی ذات کی ایسی مثال پیش کیجیے کہ وہ صالح کردار کو اپنانے کی طرف مائل ہو اور آپ کا ذکر کرتے ہوئے اُسے اُلجھنوں میں گرفتار نہ ہونا پڑے۔

○ بچے کے سامنے اُس کے استادوں یا اُستانیوں میں عیب تلاش نہ کیجیے۔

○ بچے کے سامنے اُستاد یا اُستانی کو جاہل یا نااہل ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔

○ اُستاد یا اُستانی کو اپنا حریت تصور نہ کیجیے۔

ان باتوں کا خیال نہ رکھنے کی صورت میں بچے کے دل سے اپنے اُستاد یا اُستانی کا احترام نکل جاتا ہے جس کا اثر اس کی تعلیمی دل چسپی پر پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کردار کی کجروی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔

گھر پر بچے کو پڑھنے کے لیے وقت نکالنے کا شوق دلائیے، بجائے اس کے کہ اُسے زبردستی پڑھنے کے لیے بٹھائیے۔ پڑھنے کے اوقات میں اُس سے گھر کے کام نہ لیجیے، ورنہ تعلیم کی طرف سے اُس کی توجہ ہٹ جائے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات آپ کو ایسی ضرورت پڑ جاتی ہے بعض اوقات کی بات الگ ہے، ورنہ زیادہ تر بچے کے پڑھنے کے اوقات میں بیشتر کام خود ہی کرنے کی کوشش کیجیے، اُسے تعلیم کی طرف یکسو رہنے دیجیے۔

اسکول میں بچے اپنے ہم جوبلی بنا لیتا ہے۔ اگر آپ ان ہم جولیوں کا جائزہ لیں تو اس نوعیت سے آپ کو اُس کی تعلیم میں دل چسپی کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ بد شوق بچے عام طور سے ایسے ہم جماعتوں کو دوست بناتا ہے جو درجہ میں کم زور ہوتے ہیں، لیکن تعلیم میں دل چسپی لینے والا بچہ ایسے ہم جماعتوں کو دوست بناتا ہے جو ذہین اور پڑھنے میں تیز ہوتے ہیں! اس طرح اگر آپ اُسے ذہین بچوں کو دوست بنانے کی ترغیب دیں تو تعلیم میں بھی اس کی دل چسپی بڑھ جائے گی۔

تعلیم کے دوران بچے ایسی مشکلات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے کہ بعض سبق یا سوال اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ نا تجربے کار اُستاد اُس کی ایسی مشکلوں میں بھی مدد کرنے کے بجائے سزا دیتے ہیں، جو اُس کے لیے اور بھی زیادہ مشکل پیدا کر دیتی ہے۔ والدین ایسے مسائل کی طرف یا تو توجہ نہیں دیتے یا بچے کو ہی قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ یہ رویہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اگر آپ خود اس کے سبق یا سوال میں اُس کی مدد نہیں کر سکتی ہیں تو کسی اور کے ذریعے اُس کی مشکل حل کر دیجیے، ورنہ اگر وہ ایک بار ناکام ہو تو پھر آئندہ اپنی مشکل پر قابو پانے کی ہمت نہ کر سکے گا اور تعلیم میں کمزور ہو جائے گا۔

بہر حال، آپ کا رویہ تعلیم کے معاملے میں بچے کے ساتھ ہمدردانہ اور معاونت کا ہونا چاہیے۔ صرف اس روش کے ساتھ بچہ اپنی تعلیم کامیابی کے ساتھ حاصل کر سکے گا۔

## چند لفظوں میں

- آپ اپنے تجربات اور تاثرات سے بچے کو کم سے کم خطرات، خدشات اور ناکامیوں کا سامنا کرنے دیں۔
- اچھا انسان بنانے کے لیے اچھی تعلیم دیجیے۔
- یاد رکھیے، جو باتیں بچے کے ذہن میں بٹھادی جاتی ہیں عمر بھر کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔
- ”مت کرو“ اور ”نہ کرو“ کے بجائے ”یہ کرو“ اور ”وہ کرو“ کی ہدایت دینے کا طریقہ اختیار کیجیے۔

## بچے کی خصلتیں

- خیال رکھیے، بچے کے جو افعال آپ کو بے معنی نظر آتے ہیں، وہ انھیں کسی نہ کسی مقصد کے تحت کرتا ہے۔
- بچہ زندگی کے ابتدائی دور میں ہر چیز کو کھیل ہی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ اس کی تعلیم کا ذریعہ ہے۔
- بچوں کے ایسے کھیلوں میں جن میں وہ خوشی محسوس کریں، کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ کیوں کہ ان کے ذریعے وہ بہت سی چیزوں کی حقیقت معلوم کرتا ہے۔
- اکثر اوقات بچے کی شرارت اس کا ناکام منصوبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی ناکامی کے موقع پر اس کی مدد کیجیے۔ ناراض نہ ہو کر ہمت شکنی نہ کیجیے۔
- بچے کے ہر عمل اور فعل پر اسے شریعت نہ کہیے، ورنہ وہ شرارت کو اپنا معمول بنا لے گا۔

○ بچے کی نازیبا حرکت پر اس کی اصلاح کیجیے، اُس کی ایسی حرکتوں سے لطف نہ لیجیے، ورنہ وہ آپ کو خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرے گا۔

○ بد تہذیبی اور بد اخلاقی کی روک تھام کے لیے :  
(۱) اُس کی تیزی اور شوخی کو اچھے کاموں کی طرف موڑیے۔

(۲) بے کار بیٹھ کر سوچنے کی فرصت نہ دیجیے۔

(۳) چیزوں کے بارے میں نئے نئے تجربے کرنے کی آزادی دیجیے۔

(۴) نئی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر اُکسائیے۔

(۵) ہر شرارت پر ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لیجیے۔ شرارت بچے کی قوت فکر کا پیمانہ ہے۔

○ بچے کی لڑائی جھگڑے کی خصلت کو شروع ہی سے اچھے رُخ کی طرف موڑنے کے لیے :

(۱) بچے کے پاس کھیل کود اور مشغولیت کے لیے اتنا سامان ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے بچوں کی طرف متوجہ نہ ہو۔

(۲) دوڑ بھاگ کے کھیلوں میں بچے کو خوب حصہ لینے دیں تاکہ وہ لڑائی کا موقع تلاش نہ کرے۔

(۳) جب دو بچے آپس میں اُلجھ جائیں تو اُن کی لڑائی کو ناراضگی کے بجائے مقابلے کی لڑائی بنا دیجیے۔

○ بچے کو اچھے کاموں کی نقل کرنے دیجیے، یہ زندگی کی ذمے داریوں کو سیکھنے کا ذریعہ ہیں۔

○ بچے شوق سے انھیں نقل کرتا ہے جن کو وہ خود سے برتر سمجھتا ہے۔

○ بچے کے ارد گرد ایسا ماحول بنائیں کہ جب اُس کو نقل کرنے کی خواہش ہو تو وہ اپنے سامنے اچھی ہی چیز نقل کے لیے پائے۔

○ بچے نقل کر کے اپنی ناواقفیت کی معذوری کو دور کرتا ہے، اس کے لیے وہ آپ کا



سہارا لیتا ہے، آپ اُسے تقلید کے لیے اچھے نمونے فراہم کریں۔ اپنے قول سے اپنے عمل سے۔

## بچوں کی آزادی

- آزادی کو بچے اپنا فطری حق سمجھتا ہے، اُسے مناسب حد تک آزادی دیجیے۔
- بچے بالکل نااہل نہیں ہوتا، کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیے۔
- جب بچے کوئی کام کرنا چاہے تو کرنے دیجیے۔ یہ نہ کہیے کہ "تو کیا کر پائے گا۔" البتہ جب غلطی کرنے لگے تو اس کی مدد کیجیے تاکہ وہ صحیح کام کر سکے۔
- آپ کی مدد کو حد سے آگے نہ بڑھنا چاہیے، ورنہ بچے کی آزادی مستأثر ہو جائے گی۔
- بچے کے لیے سب سے زیادہ مضر چیز یہ ہے کہ اس کے ساتھ بلاوجہ کی روک ٹوک روارکھی جائے۔
- بچے کبھی پسند نہیں کرتا کہ آپ ہر وقت اس کی خامیوں کو گناتی رہیں۔ اُس کی خوبیاں بھی گنائیے اور خوش رہنے دیجیے۔
- بچے کی آزادی کو اس طرح سلب نہ کریں کہ اس کا دل نہ چاہتا ہو اور آپ زبردستی اس سے کام کرائیں۔

## بچوں کے کھیل

- بچے پر سب سے بڑی ذمے داری کھیل کی ڈالیے۔ یہاں تک کہ تعلیم کو بھی کھیل بنا دیجیے۔
- کھیل کے ذریعے بچے کو کچھ سکھانا زیادہ آسان ہوتا ہے، بہ نسبت کام کے بوجھ کا احساس دلا کر۔
- ہمیشہ بچے کو اپنے ہم عمروں میں اور اچھے اخلاق کے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور دلچسپی

لینے کے لیے ابھاریے۔

○ اس کا اہتمام کیجیے کہ کھیل میں بچہ اپنے ذہن پر زور ڈال کر اپنی اُلجھن حل کرنا سیکھ

## ابتدائی تعلیم

○ بچے کو تعلیم کے لیے ایسی پڑوسنوں کے حوالے نہ کیجیے جو بچے کی تعلیم سے زیادہ اپنے گھر کے کام کرنے میں دل چسپی لیتی ہیں۔

○ جن مدرسوں یا اسکولوں میں اُستانی یا اُستاد ہر بچے کی طرف خصوصی توجہ نہیں دے پاتے وہاں بچے کا ذہن ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔

○ بچہ مدرسہ یا اسکول میں چند گھنٹے رہتا ہے اس کا بیشتر وقت آپ کے پاس گذرتا ہے، اس لیے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ پر زیادہ ہے۔

○ ابتدائی تین سال کی عمر تک بچہ لکھنا پڑھنا نہیں سیکھ سکتا۔

○ تین سال کی عمر تک بچہ جملے بنانے اور جملوں میں ربط پیدا کرنے میں دل چسپی نہیں لیتا۔

○ پانچ سال کی عمر تک اُس کے لیے تین یا چار الفاظ سے زیادہ کا جملہ ذہن پر بار ہوتا ہے۔

○ پانچ سال کی عمر تک عملی تعلیم زیادہ کامیاب ثابت ہوتی ہے۔

○ حساب مشکل مضمون نہیں ہے۔ اسے بچہ اُس وقت سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ جب اُسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ حساب کیا ہے۔

○ پہلی بار جب بچہ اسکول پہنچتا ہے تو اس کے لیے وہاں کا ماحول اجنبی ہوتا ہے۔ اس اجنبیت کو ہوشیاری سے دُور کرائیے۔

○ زبردستی اسکول روانہ کرنے کے بجائے محبت کے ساتھ اور اس کی ذات میں پوری دل چسپی لے کر اسکول کے لیے رخصت کیجیے، تاکہ اسکول جانے کا شوق پیدا ہو۔

- پانچ سال کی عمر تک بچے ہر موقع پر اپنے والدین کا ذکر کرتا ہے، پھر اپنے استادوں یا اُستانیوں میں بھی دل چسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔
- بچے کے سامنے اپنی ذات کی ایسی مثال پیش کیجیے کہ وہ صحت مند کردار کو اپنانے کی طرف مائل ہو اور آپ کا ذکر کرتے ہوئے اُلجھنوں میں گرفتار نہ ہو۔
- بچے کے سامنے اُس کے استادوں یا اُستانیوں میں عیب تلاش نہ کیجیے۔
- بچے کے سامنے اُستاد یا اُستانی کو جاہل یا نااہل ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔
- اُستاد یا اُستانی کو اپنا حریف تصور نہ کیجیے۔
- گھر پر بچے کو پڑھنے کے لیے وقت نکالنے کا شوق دلائیے۔
- پڑھنے کے اوقات میں اُس سے گھر کا کام نہ لیجیے۔
- اُسے ذہین بچوں کو دوست بنانے کی ترغیب دیجیے۔ تاکہ تعلیم میں بھی اُس کی دل چسپی بڑھے۔
- اگر بچے کسی سوال یا سبق کو سمجھ نہیں پا رہا ہے تو اُس کی مدد کیجیے یا کر لیے۔
- تعلیم کے معاملے میں بچے کے ساتھ آپ کا رویہ ہمدردانہ اور معاونت کا ہونا چاہیے۔

# کردار کی تشکیل

اب تک بچے کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ تفصیل سے بیان کرنے کی غرض سے ذرا بھینلا کر اور الگ الگ بیان کیا گیا ہے، لیکن اب جب کہ ہم اس کی زندگی کے مختلف گوشوں سے واقف ہو چکے ہیں ہمارے لیے یہ معلوم کر لینا ضروری ہو گیا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی شخصیت کا مکمل اور یک جائی خاکہ کیا ہونا چاہیے؟

بچے میں جن صفات کو ابھارنے کی طرف اب تک توجہ دلائی گئی ہے ان کو سامنے رکھتے ہوئے اب اس کے بارے میں غور کیجیے کہ کیا وہ اس لائق ہو گیا ہے کہ سن شعور کو پہنچ کر:

- اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنا اپنے لیے ضروری سمجھے گا؟
  - اللہ تعالیٰ کے بندوں پر جو حقوق ہیں ان کا ادا کرنا اپنے لیے ضروری سمجھے گا؟
  - اپنے عادات و اطوار کے لحاظ سے صحیح معنوں میں مسلم کہلا سکے گا؟
- بچے کو اس خاکے کے مطابق تیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ شروع سے ہی اس کو ایسے ماحول میں پروان چڑھنے دیں جس میں وہ اپنی سرشت کے مطابق جن چیزوں اور جن افعال کو اختیار کرے وہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے ہوں۔ بچے کی سیرت عموماً ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اس کے گرد و پیش کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس طرح (جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں) سب سے بڑی ذمے داری اس کے ماحول، اس کے گرد و پیش

کو سنوارنے سدھارنے کی ہوتی ہے۔ آئینے میں بالکل ویسا ہی عکس پڑتا ہے جیسی کہ اصل کی صورت ہوتی ہے۔ اسی طرح بچہ انہیں طور طریقوں کو اختیار کرتا ہے جو اس کے دوسرے بزرگ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اگر اس کے والدین اور دوسرے گھر والوں کے دل میں خدا کا خوف ہے اور وہ پوری ذمے داری کے ساتھ اللہ کی جزا و سزا کا احساس بھی اپنے دل میں رکھتے ہیں، اور اپنے تمام اعمال کو ان حدود کے اندر ہی رکھتے ہیں، تو یہ تقریباً ناممکن ہوگا کہ بچہ ویسا نہ بنے۔

ہم عام طور سے دیکھتے ہیں کہ گھر والے تو بڑے ہی بھلے اور نیک ہیں لیکن بچے ان کے بالکل برعکس ہیں۔ اگر ماں باپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو بچہ اللہ تعالیٰ کا مذاق اڑاتا ہے۔ اگر ماں باپ فرائض دینی ادا کرتے ہیں تو بچہ جرائم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں بس یہی سمجھ کر نہ بیٹھ جانا چاہیے کہ یہ بچے کی اپنی سرشت کی خرابی ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ وہ اصل خرابی اور کوتاہی کہاں ہے جس نے ان خرابیوں کو پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا۔

عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ بچے کو اس زمانے میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب واقعی وہ اپنی سیرت کی تعمیر کر رہا ہوتا ہے اور یہ پانچ سال تک کی عمر کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ غلط سلط بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کر چکا ہوتا ہے، تو ایک دم سے اس کی فکر کی جاتی ہے، حالاں کہ اب بہترین زمانہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اب تو زیادہ سے زیادہ آپ اتنا کر سکتی ہیں کہ آئندہ اس کو بگڑنے نہ دیں، اور اس نے جو خرابیاں اختیار کر لی ہیں ان کو بڑی کوشش اور کاوش سے دور کریں۔

اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ زندگی کی تعمیر اس طرح شروع کی جائے کہ سب کچھ ہم ہی بنائیں نہ یہ کہ کسی اور کے بنائے ہوئے کو پہلے بگاڑیں اور پھر اپنی بنیاد رکھیں۔ ایک بار اگر آپ کسی کاغذ پر چند نقوش بنالیں، پھر ان کو مٹا کر دوبارہ نقوش بنائیں تو آپ خود دیکھیں گی کہ دوبارہ بنائے ہوئے نقوش کس قدر بھدے ہیں۔ اس لیے پہلی اینٹ آپ اپنے ہاتھ سے رکھیں اور وہ ہے اپنے ماحول کو مسلمان بنانا۔ پھر اس نئی تعمیر کے لیے آپ قرآن و سنت کو ذریعہ بنائیں۔ اس میں جن خوبیوں کو مسلم کی خوبیوں کے ساتھ گنایا گیا ہے انہیں آپ اپنے بچے میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

مثلاً بچے میں خوف اگر کسی کا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کا ہو۔ اس کو ایسے واہموں میں مبتلا نہ کر دیں جو اس کو بزدل اور کم ہمت بنا دیں۔ بچے کے دل میں جب بی بات بیٹھ جائے کہ نفع نقصان پہنچانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کوئی اور ذات کوئی اور ہستی نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ تکلیف۔ تو پھر وہ بہادر، بڈر اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنے والا بنے گا۔ اس کے اندر سے بہت سے خوف اور ڈنوسوں سے خود بخود رخصت ہو جائیں گے۔ یہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ جب آپ اس میں خوف اور ہراس کا ذرا سا بھی شائبہ پائیں تو آپ اس کی ہمت بندھا لیں۔ آپ کا سہارا اس کے لیے بہت بڑا سہارا ثابت ہوگا۔

اسی طرح جب آپ اس کو چھوٹی موٹی تکلیفوں کو نظر انداز کر دینے اور ان کو اہمیت نہ دینے کی طرف اکسائیں گی تو وہ بڑا ہی بلند ہمت انسان بن کر پروان چڑھے گا۔ پھر اس کے اندر جگہ جگہ پر جھجک اور اجنبی پن محسوس کرنے کی کمزوری راہ نہ پاسکے گی۔ زندگی کی دوڑ میں ایسے ہی لوگ آگے نکلتے ہیں جو کم ہمت نہیں ہوتے۔

بلند ہمتی کے ساتھ بچے میں برداشت اور صبر کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مسلمان کی اعلیٰ ترین صفات میں سے ایک ہے۔ صبر اور برداشت سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں مجبوری اور لا چاری کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ دراصل صبر اور برداشت وہ وصف ہے جو انسان کو پہاڑ کی طرح مضبوط بنا دیتا ہے۔ بڑی سے بڑی تکلیف کو برداشت کر لینا اور بُرے سے بُرے وقت میں ہنسی خوشی دن گزار لے جانا ممکن ہو جاتا ہے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس بات کی گواہ ہے۔ آپ شعب ابی طالب میں تقریباً تین سال تک اپنے تمام مسلم ساتھیوں کے ساتھ کفار کے محاصرے میں اس طرح رہے کہ اناج کا ایک دانہ بھی ان تک پہنچا مگر نہ تھا۔ مسلمانوں نے پڑانے چمڑے کے ٹکڑوں تک کو اُبال کر کھایا لیکن اپنے ایمان پر جسے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہ حالات پیدا کر دیے کہ وہ آزاد ہو جائیں لیکن فرض کیجیے! اگر وہ پیختے چلاتے اور پینا ہ کے طالب ہوتے تو کیا آج اسلام اس طرح عالمگیر ہو سکتا؟ اور ان کے سروں سے وہ مصیبت ٹل سکتی؟ ایسا کبھی بھی نہ ہوتا۔ بلکہ یہ چیخا چلانا مصیبت کے احساس کو اور زیادہ بڑھا دیتا

اور وہ اور زیادہ پریشان ہو جاتے۔

آج کل ہمارے گھروں میں کچھ یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ملازمہ نے بستر تہہ نہیں کیے۔ بس اتنی سی بات پر کوسنا اور بکنا شروع ہو گیا:

”میری تو زندگی اجیرن ہے، جس کے گھر میں اتنے اپنے ملازم ہوں وہ بھی اپنی جان کو روئے۔ اللہ کی شان ہے۔ خاک پڑے میں مرجاتی تو اچھا ہوتا۔“ بھلا غور کیجیے کہ ان خلی کٹی نے کہیں بستر تہہ کر دیا ہے۔ نہیں، بلکہ گھر کی فضا کو اور بھی زیادہ مکدر کر دیا۔ اب ملازمہ کی باری آتی ہے وہ بھی چینی چلاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر کا ہر فرد بالکل ایسے چڑچڑ سے پن سے پیش آنے لگتا ہے کہ گھر ایک جہنم بن جاتا ہے۔ بھلا ایسے گھر والوں پر کوئی بڑی مصیبت آجائے تو ان کا کیا حشر ہو؟ اس وقت تو شاید وہ واقعی خود کشی کر لیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایسے گھرانوں میں پرورش پلنے والے بچے کسی بڑے کام کو ہاتھ میں لینے سے گھبراتے ہیں۔ مصیبت میں ان کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور وہ اُس کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ کیوں کہ انھوں نے تو اپنے گھر والوں کو ذرا سی بات پر کھرام مچاتے ہوئے دیکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس زندگی ہی میں بہت بڑے خسارے میں رہتے ہیں۔

اس سے بچانے کے لیے یا یوں کہیے کہ ان میں صبر اور برداشت کا مادہ پیدا کرنے کے لیے گھر کے ماحول کو بڑا سنجیدہ بنایا جائے۔ گھر میں لوگ کسی چھوٹی سی بات پر تیغ و تلوار اٹھیں اور نہ اس کے جگہ بے جگہ پیشاب یا پاخانہ کر دینے پر خلی کٹی سنا سنا شروع کر دیں بلکہ بڑے ہی تحمل کے ساتھ وہ کچھ انجام دیں جس کے کر چکنے کے بعد وہ کام ختم ہوتا ہے خود بچے کو بھی بتائیں کہ تم تو بڑے اچھے ہو، پھر تم اتنی ذرا سی بات پر کیوں رو دینے۔ دیکھو تمہارا کام تو اس طرح یوں ہو جائے گا، تم کو رونے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔

اب ایک اور صفت جو اس کے لیے ضروری ہے وہ خوش طبعی ہے، یعنی دوسروں سے وہ ملے یا بات کرے تو اس کی باتوں سے لوگوں کے دل کھل اٹھیں اور وہ محسوس کریں کہ واقعی انھوں نے ایک پیارے بچے سے بات کی ہے جس نے ان کے دل میں جگہ کر لی ہے۔ وہ تمام لوگ جو دوسروں کے دل اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں ان کی یہ صفت

ہوتی ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آپ جب بھی لوگوں سے گفتگو فرماتے تھے تو آپ کے ہونٹوں پر بڑی ہلکی سی مسکراہٹ دکھیلتی رہتی تھی۔ یہ ایسی خوبی ہے جو دوسروں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور وہ گفتگو کرتے ہوئے مسرت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ برخلاف اس کے ہمارے گھروں میں ہر بات ناک بھون چڑھا کر کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کی بات کا جواب بڑھم ہو کر دیا جاتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا اس سے بچنے کے اندر نفرت کے جذبات پرورش نہ پائیں گے؟ کیا اس سے اس کے اندر کی حمدی ختم نہ ہو جائے گی؟ یہ کتنا بڑا ظلم ہے! اس سے ہم کو دور ہی دور رہنے کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ قہقہے لگاتے رہنا اور بے کار کے ہنسی مذاق میں اُلجھے رہنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ اسی طرح مسلمان کو بد اخلاق اور تلخ گفتار ہونا بھی تو زیب نہیں دیتا۔ آپ کو وہ حدیث تو یاد ہوگی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو عورتوں کا ذکر کیا گیا، جن میں سے ایک نوافل زیادہ سے زیادہ ادا کرتی تھی لیکن اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بد اخلاقی برتی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنتی قرار دیا تھا اور اس عورت کو جو نوافل ادا نہیں کرتی تھی اور اگر ادا کرتی بھی تھی تو بہت کم، لیکن پڑوسیوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آتی تھی آپ نے اس کو جنتی قرار دیا تھا۔ اب اس حدیث کو سامنے رکھیے اور خوش طبع اور با اخلاق انسان کے بارے میں سوچیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کس قدر خوشنودی کا مستحق ہوگا۔

بس اسی لیے آپ کے واسطے ضروری ہے کہ گھر کے ماحول کو بچے کی اعلیٰ سیرت کے مطابق بنائیں اور خود اس کو بھی شگفتہ اور دوسروں کے لیے شیریں کلام بنانے کی کوشش کریں۔ یعنی اس کو عملاً سمجھائی رہیں کہ کس وقت اس نے اچھی طرح گفتگو کی اور کس وقت غلط اور کس طرح کی گفتگو اور دوسروں سے کیسا برتاؤ پسندیدہ ہے اور کون سا طریقہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند ہی اس کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔

خوش طبعی بذاتِ خود کئی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ یعنی اس سے دوسروں کے لیے ہمدردی



اُن کے آٹے وقت میں کام آنا، غریبوں کی مدد کرنا، بیماروں کی عیادت کرنا وغیرہ قسم کی عادات خود بخود پرورش پاتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ خوش طبعی دکھاوے کی نہ ہو، بلکہ فطری ہو اور تمام لوگوں کے ساتھ ہو، خواہ امیر ہوں یا غریب، خواہ والدین ہوں یا ملازم!

بچوں میں ایک غلط عادت عام طور سے اپنے پائے کی ڈال دی جاتی ہے۔ جب وہ کوئی چیز کھانے یا لینے کی طرف توجہ نہیں دیتا تو کہا جاتا ہے ”لے لو ورنہ آپا کو دے دوں گی“ اب بچہ آپا کو اپنا حریف سمجھنے لگتا ہے اور یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اُس کی بہن کو کسی چیز میں حصہ دار نہیں ہونا چاہیے یہی خود غرضی وہ آگے بڑھ کر دوسروں کے ساتھ بھی برتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بذاتِ خود بڑا ہی کنجوس اور خود غرض بن جاتا ہے، حالانکہ اس کے اندر اتفاق کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے دل کے اندر اتنی وسعت ہونی چاہیے کہ وہ دوسروں کے وقتِ ضرورت کام آسکے۔ اُس کو اپنی چیزوں سے اتنی زیادہ محبت نہ ہوتی چاہیے کہ دوسرے تو اُس چیز کے لیے تڑپتے رہ جائیں اور وہ اپنی چیز کو بے مصرف اُن سے چھپائے رہے۔

اتفاق کی عادت ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر والے ایسے مظاہرے نہ کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنی قیمتی بھی پڑوس میں اس لیے دینا نہیں چاہتے کہ وہ اپنی قیمتی کیوں نہیں رکھتی ہیں؟

اور یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کو اپنی چیزوں میں دوسروں کا حصہ لگانے دیا جائے۔ دوسروں کی طرف سے یہ حسد نہ پیدا کرائی جائے کہ اگر وہ نہ لے گا تو دوسرا پا جائے گا۔ عام طور سے بچے کے بارے میں یہ سوچا جاتا ہے کہ وہ بچہ ہے۔ وہ ابھی سوچ بچار کیا کر سکتا ہے؟ یہ بڑا خطرناک تصور ہے۔ بچے کو اگر چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرنے کے لیے اُکسایا جاتا ہے گا تو آئندہ زندگی میں وہ بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کر سکے گا اور اُن کے حل کے لیے اچھی اچھی تدبیریں سوچے گا۔ بڑے بڑے لوگوں کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ بچپن میں وہ دوسرے بچوں کے برخلاف کھیل کود میں اپنا سارا وقت ضائع نہیں کر دیتے تھے بلکہ اپنی چیزوں کے بارے میں اکثر اکیلے بیٹھ کر سوچا بھی کرتے تھے۔ اسی غور و فکر نے ان میں یہ صفت پیدا کر دی کہ ایسے اشخاص نے بڑے بڑے طبقوں کی فکری رہنمائی کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے:

”تفکر و تدبیر بھی عبادت ہے۔“

غرض اسی طرح کی کتنی صفات ہیں جن کو اگر آپ آہستہ آہستہ بچے کے اندر پیدا کرنا شروع کر دیں تو وہ ایک دن اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بندہ بن کر دنیا کے سامنے خود کو پیش کرے گا پھر ایسے ہی بندے اللہ تعالیٰ کی اس کائنات کو خیر و فلاح سے بھر دیں گے اور اس وقت ہی آپ اپنی اس آزمائش میں کامیاب ہو سکیں گی جس کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی شکل میں آپ کے لیے مقرر کیا ہے۔

کردار کی تشکیل کے لیے ہمت افزائی بہت ضروری ہے۔ کسی بھی موقع پر بچے کو آپ یہ احساس نہ ہونے دیں کہ وہ بے کار کوشش کر رہا ہے، وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دوسری چیز آپ کا اس کے ساتھ خلوص اور اُس کی ذات میں دل چسپی ہے۔ تیسری چیز آپ کا کثرت سے ان مثالوں کو پیش کرنا ہے جو اس کے عمل کرنے کے لائق ہوں۔ ایسی چیزوں کی مثالوں سے اُسے دُور رکھنا ہی اچھا ہوگا جو اس کو نہیں کرنی ہیں اور نہ آپ جانتی ہیں کہ کسی موقع پر بھی اس کو یہ ترغیب ہو سکتی ہے کہ وہ ان کو بھی کر گزرے۔

آجکل کی مصروف زندگی میں جب کہ ماں اور باپ دونوں کو معاشی اور گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنی ہوتی ہیں، یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ماضی کی طرح بچے کے ساتھ ہر وقت رہا جائے یا ہر کام میں اُس کی مدد کی جائے، اُسے دن کے بیشتر وقت میں تنہا چھوڑنا پڑتا ہے اور بچے پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے کام خود انجام دے لے گا۔ مثلاً آپ بچے کو اسکول جانے والی رکشہ پر بٹھا دیتی ہیں اور مطمئن ہو جاتی ہیں کہ وہ دوپہر یا شام کو بخیر و عافیت واپس آجائے گا۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو پھر بچے کو پڑھانا یا گھر پر بٹھائے رکھنا دونوں کام مشکل ہو جائیں گے۔

اُس پر یہ بھی اعتماد کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے کام خود کر لے گا، اپنے لیے ضروری خریداریاں خود کر سکے گا، گھریلو کاموں میں آپ کی مدد کر دیا کرے گا، اپنے کپڑوں اور یونیفارم کی دیکھ بھال خود کر لے گا۔ یہ سب توقعات آپ کو آج کے دور کے بچے سے کرنی ہی پڑتی ہیں کیوں کہ ہر ایک کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ ملازم یا ملازمہ رکھ لے اور بے فکر ہو جائے۔ اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ بچے میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ اُسے چھوٹے موٹے

کام کرنے کا شوق دلائیے، اپنی اسٹیشنری وغیرہ خریدنے اور فیس وغیرہ جمع کرنے کی ذمہ داری سونپئے۔ پنک اور کھیل وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے بہت افزائی کیجئے، اسکول کی اُستانیوں اور بچے بچوں کے ساتھ جانے سے نہ روکیے تاکہ وہ اپنی آزادانہ زندگی گزارنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کر سکے۔

آجکل بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ والے شہروں اور آبادیوں میں بچوں کو ہر وقت ٹرینک سے خطرہ پیش آتا رہتا ہے۔ اس لیے اُسے راستے پر چلنے کے آداب و اصول سکھائیے۔ ٹرک یا گلی کے کنارے کنارے راستہ صاف دیکھ کر ہی ایک طرف سے دوسری طرف گزرنے تیز رفتار گاڑیوں سے بچنے وغیرہ کی ہدایات دیجئے۔ بچوں کو اگر شروع سے ہی بہت محبت اور لگاؤ کے ساتھ رفتہ رفتہ بتایا جاتا ہے تو بچے ان سب احتیاطوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ انھیں بتانے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ سکھانے کی۔

بچوں کو پھرتی کے لیے اغوا کرنے، چوری، گداگری اور بندھوا مزدوری وغیرہ کے لیے بچوں کو اٹھالے جانے کا بھی خطرہ عام ہو گیا ہے۔ اس طرح کے جرائم کے لیے عموماً لالچ، اور دھوکے کے حربے اپنائے جاتے ہیں۔ مثلاً بچے کو بڑی معصومیت اور محبت کے ساتھ کھانے پینے کی چیز پیش کی جاتی ہے۔ بچے بغیر کسی شک و شبہ کے کھا لیتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ پھر بے ہوشی کے عالم میں اُسے اغوا کرنا یا چرالے جانا آسان ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مجرم انتہائی گھبرایا ہوا پریشانی کی حالت میں بچے کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری ماں کا (یا باپ کا) ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ جلدی چلو۔ بچہ تو اس باختہ ہو کر اُس مجرم کے ساتھ چلا جاتا ہے اور مجرم کا کام بن جاتا ہے۔ اب مار دھاڑ کی فلموں اور ٹی وی پروگراموں نے ایک اور طریقہ رائج کر دیا ہے۔ بچے کو اکیلا پاکر مجرم ہسپتال یا چاقو وغیرہ نکال لیتا ہے اور اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بچہ جان کا خطرہ دیکھ کر مجرم کے ساتھ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور مجرم اپنا کام بنا لیتا ہے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ اس مکروہ مجرم میں ہماری محافظ پولیس بھی شریک ہوتی ہے، اس لیے بے چارے بد نصیب ماں باپ ساری عمر کھوئے ہوئے بچے کو ڈھونڈتے رہتے ہیں اور بچہ نہیں ملتا۔ پھرتی کے لیے اغوا کیے جانے والے بچے زیادہ تر زندہ واپس نہیں ملتے ان کی لاشیں

ملتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زندہ واپس آنے والے بچے سارے راز فاش کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں جرم کرنے والوں کے ساتھ کرانے والے بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بھانڈا پھوٹنے سے بچنے کے لیے معصوم نو نہال کی ہی جان لے لی جاتی ہے۔ اس بے قصور کو ہی قربان کر دیا جاتا ہے۔

اس خطرے سے بچانے کے لیے والدین کو چاہیے کہ وہ بچے میں یہ خود اعتمادی پیدا کریں کہ وہ حالات و حادثات کا مقابلہ خود کر سکے۔ اُسے خوب اچھی طرح تربیت دی جائے کہ اجنبی کے ہاتھ کا دیا ہوا کچھ نہ کھائے۔ راستہ چلتے انجان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئے کسی غیر کی بتائی ہوئی پریشان کن خبر پر یقین نہ کرے۔ اگر کوئی شخص ہتھیار دکھا کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرے تو تنہائی سے نکل کر آباد جگہ پر آتے ہی لوگوں کو مدد کے لیے پکارے۔ اپنا تحفظ آپ کرنے کی صلاحیت عام طور سے سب ہی بچوں میں ہوتی ہے۔ آپ کو صرف اتنی توجہ اور کرنی ہے کہ اُس میں اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت اور پروان چڑھ جائے۔

ان انفرادی خطرات کے علاوہ ایک اور بڑا خطرہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان دشمن جنوبی درندے لوٹ مار، آتش زنی اور قتل و غارت گری پر اتر آتے ہیں اور چاروں طرف فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ اتنا اچانک ہوتا ہے کہ جو جہاں ہوتا ہے وہاں پھنس جاتا ہے۔ اسکول یا بازار گئے ہوئے بچے عموماً اس شیطنت اور درندگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جو بچے چاروں طرف سے گھر جاتے ہیں انھیں تو صرف خدا ہی بچا سکتا ہے لیکن بعض اوقات ایسی صورت بھی ہوتی ہے کہ اگر بچہ ذرا سی حاضر و ماضی سے کام لے تو وحشیوں کے جنگل سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً جانے بوجھے راستے سے نکل جانے کی کوشش کرنا، اپنے ہی لوگوں کے گھروں میں پناہ لینا۔ کسی ایسی چیز کے پیچھے چھپ جانا جس پر یہ شبہ نہ ہو سکے کہ یہاں کوئی چھپا ہوا ہے۔

موت کا خطرہ بڑی عمر والوں تک کو بندھوا س کر دیتا ہے، پھر بچوں کا کیا شمار ہے! لیکن جب ہمیں ان حالات کا آئے دن سامنا کرنا ہی ہے تو اپنے علاوہ اپنے بچوں کو بھی ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کا عادی بنانا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ معصوم ذہنوں کو شرپرستوں کے مقابلے

کے لیے تیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اُن کی عمر کے انتہائی ناپختہ دور میں انہیں وہ تربیت دی جائے جس کے لیے ابھی اُن میں سمجھ بوجھ بھی پیدا نہیں ہوئی ہے مگر ہم آپ کو یہ خطرہ تو ہر وقت دروازہ کھٹکھٹایا کرتا ہے۔

خطرے سے بچنے اور اپنی حفاظت آپ کرنے کی صلاحیت اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ہر جاندار میں پیدا کی ہے۔ ہر ذی حیات جان کے خطرے کو پہلے ہی محسوس کر لیتا ہے اور اپنے بچاؤ کی کوشش کرتا ہے۔ بچوں میں بھی یہ صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ بھی خطرے کو محسوس کر لیتے ہیں اور اپنے بچاؤ کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی سمجھ کے مطابق اپنا بچاؤ کریں، اور دوسرا طریقہ وہ ہوتا ہے جو انہیں تجربہ کار لوگوں کے ذریعے سکھایا جائے۔ مثلاً اس مقصد کے لیے بچوں کو تیز رفتار سے دوڑنا سکھایا جائے۔

تیز دوڑنا ہی ہر موقع پر فائدہ مند نہیں ہوتا۔ سچھا کرنے والے یا حملہ کرنے والے کو چھکا وادینے کے لیے اور اُس کی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے لہرکھا کر (کاواک) ٹیڑھا ترچھا دوڑنا چاہیے۔ تاکہ حملہ آور کی بھی رفتار سُست پڑ جائے۔ گلیوں، کھمبوں، دروازوں، بسکوں وغیرہ کی جلد جلد آڑ لینا چاہیے۔ جب گولیاں چل رہی ہوں تو فوراً زمین پر لیٹ جانا چاہیے اور زمین پر رہینگتے ہوئے حملہ آور کی زد سے بچنا چاہیے۔ یہاں تک کہ گولیوں کے نشانے یا رینج سے وہ باہر ہو جائے۔

آگ میں پھنس جانے کی صورت میں اگر ممکن ہو تو کوئی موٹا کپڑا مثلاً کمبل، درمی الحاف کھدر کی چادر وغیرہ پانی میں تر کر کے اپنے بدن پر لیٹ لینا چاہیے اور شعلوں کے بیچ سے تیزی سے نکل آنا چاہیے۔ آگ سے جلتے ہوئے فرد پر پانی ڈالیں۔ آگ بجھنے کے بعد یقیناً پھالے پڑ جائیں گے، لیکن آگ کھال سے نیچے اثر نہیں کر سکے گی۔

ان سب سے بڑی بات بچے میں یہ اعتماد پیدا کیجیے کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھے۔ اور یہ یقین رکھے کہ اگر خدا کو منظور نہیں ہے تو شیطانی حملہ آور کامیاب نہ ہو سکیں گے اور یہ بھی کہ اُس کی مدد کرنے والا اللہ ہے۔ وہ اللہ ہی کی مدد سے خود کو شیطانی درندوں سے بچانے کی

کوشش کر رہا ہے۔ یہ ایمان جب بچے میں تازہ ہوگا تو اُس میں اپنی ذات پر اعتماد بھی پیدا ہو جائے گا۔

بچے میں دوسروں کی مدد کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کرنا چاہیے۔ یہ اُس کے کردار کی بے حد اہم خوبی بن جائے تو وہ ملت کے لیے قابلِ قدر ہستی بن جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

مُسلِمَانُ مُسلِمَانِ كَأَيْتِنَا هُوَ اور مُسلِمَانُ مُسلِمَانِ كَابُهَائِي  
ہے۔ وہ اُس کو بربادی سے بچاتا ہے اور پیچھے سے  
اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

اس حدیث کے پہلے جملے کے پہلے حصے کا مفہوم مولانا جلیل احسن ندوی صاحب مرحوم نے یہ بیان کیا ہے کہ ”ایک مسلمان دوسرے مسلمان ..... کی تکلیف کو اپنی تکلیف جانے جس طرح وہ اپنی تکلیف سے تڑپتا ہے اسی طرح دوسرے کی تکلیف پر بھی یہ تڑپ اُٹھے اور اُس کو دُور کرنے کے لیے بے چین ہو جائے۔“ میری نظر میں ایسی مدد کے لیے ہم اُس وقت آمادہ ہو جاتے ہیں جب وہ درندہ صفت اشرار لوٹ مار، قتل و غارت گری، آتش زنی اور فساد پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اس حملے میں کتنی ہی جانیں شہید ہو جاتی ہیں، کتنی ہی املاک تباہ ہوتی ہیں اور کتنے ہی بوڑھے، جوان اور بچے زخمی ہوتے ہیں، بے گھر ہو جاتے ہیں اور بے بار و مددگار ہو کر پناہ اور کفالت چاہتے ہیں۔ یہ بڑا عبرت انگیز اور دردناک سماں ہوتا ہے۔ ایسے عالم میں ہر فرد، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ہماری مدد کا مستحق ہوتا ہے۔

اگر ہم اپنے بچوں کو ایسے موقعوں کے لیے تربیت دیں تو ہم نہ صرف ثواب کا کام کریں گے بلکہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔ فساد زدہ مظلوموں کی مدد بچے بڑی اچھی طرح اور مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں۔ مثلاً زخمیوں کی ابتدائی طبی امداد (فرسٹ ایڈ)، غذا کی فراہمی، کپڑوں کا جمع کرنا، پناہ گاہوں میں پانی، روشنی اور کھانا پکانے کے لیے برتنوں اور ایندھن کا انتظام کرنا۔

یہ درست ہے کہ بچے یہ سب کام خود اپنے طور پر نہ کر سکیں گے لیکن ان کاموں میں

وہ بڑوں کی مدد کر سکتے ہیں اور بڑوں کی نگرانی میں چھوٹے موٹے وفاہی کام بھی کر سکتے ہیں۔ جب ایسی صورت حال کا خطرہ ہو تو بچوں کو اس نوعیت کی تربیت دینی چاہیے۔ عام دنوں میں معصوم ذہنوں میں تناؤ پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ انھیں بتانا چاہیے کہ اصل زندگی خیر و فلاح کی زندگی ہے اور یہی مومن کی ایسی زندگی ہے جسے اللہ سبحانہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

آخر میں ایک بار پھر میں آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ بچے کا کردار مثبت ہونا چاہیے۔ وہ خیر و فلاح اور خدمت و بہمداری کی خوبیوں کا حامل ہو۔ اس کے سوچنے کا انداز اپنی مدد آپ اور دوسروں کے لیے فکر مندی کا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو یاد رکھیے:

”ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ پسند

وہ (بندہ) ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ نیک سلوک

کرے۔“ (مشکوٰۃ)

مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ مظلوموں کی مدد کی جائے اور انسانیت دشمنوں اور شر پسندوں سے انھیں بچایا جائے۔ ایسے کرداروں کے ذریعہ ہی معاشرہ خوش گوار اور پُر امن بن جاتا ہے۔ اپنے بچے کا ایسا کردار بنانے میں اللہ سبحانہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔ آمین

## چند لفظوں میں

○ بچے کے اعلیٰ کردار کے لیے ایسا ماحول فراہم کیجیے جو اس کی سرشت کے مطابق ہو اور اس کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو۔

○ بچے پانچ سال کی عمر میں اپنی شخصیت کی پوری تعمیر کر لیتا ہے۔ آپ کو اسے جو کچھ بنانا ہے اس عمر میں ہی بنایے۔

- پانچ سال کے بعد کردار کے بناؤ بگاڑ میں بچے کی تو تین ضائع ہوتی ہیں۔
- کردار کی تشکیل کے لیے ہمت افزائی بہت ضروری ہے۔
- آپ کا خلوص اور دل چسپی دوسرے ضروری مطالبات ہیں۔
- قابل تقلید اور لائق عمل مثالوں کا پیش کرتے رہنا تیسرے اہم مطالبات ہیں۔
- منفی اور مضر مثالوں کا تقریباً نہ پیش کرنا ہی سود مند رہے گا۔
- بچہ اپنا کام خود کر لے۔ اس کے لیے آپ کو اس پر بھروسہ کرنا ہوگا۔
- خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے اُسے اپنے چھوٹے موٹے کام کرنے کا شوق دلائیے۔

- ٹریفک کے خطرات سے بچنے کی ٹریننگ دیجیے یاد دلائیے۔
- اغوا کرنے والوں سے محفوظ رہنے اور بچنے کے طریقے سکھائیے۔
- فسادات کے زمانے میں اپنی حفاظت آپ کرنے کی تربیت دیجیے۔
- آگ، گولیوں اور قاتلوں کے حملوں سے بچنا سکھائیے۔
- امن کے زمانے میں بچوں کے ذہنوں کو تناؤ اور کشمکش میں مبتلا نہ کیجیے۔
- ہر ایک کی مدد کرنا سکھائیے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم!
- ابتدائی طبی امداد (فرسٹ ایڈ) کی ٹریننگ دیجیے۔
- بچے کا کردار مجموعی طور پر خوش گوار اور پُر امن معاشرہ کے فرد کا سا بننا چاہیے۔



## آخری بات

اب آیتے آخر میں اُن غلط فہمیوں کو بھی دور کر دیا جائے جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہوں گی۔

دیکھیے پہلے اس بات کا خاص طور سے لحاظ رکھیے کہ اگر آپ کے بچے میں چند ایسی خامیاں ہیں جن کا تذکرہ یہاں ہو چکا ہے تو یہ یہ تصور کر لیجیے کہ وہ بالکل ناقص ہے، وہ بہت ہی بُرا ہے، اور آپ اس سے نفرت کرنے لگ جائیں۔ اس طرح تو اس میں وہ خامیاں اور بھی جڑ پکڑتی چلی جائیں گی۔ اس کے برخلاف اگر آپ چاہتی ہیں کہ اس کی خامیاں دُور ہوں تو اس میں کچھ خوبیوں کو بھی تلاش کیجیے۔ پھر ان خوبیوں کو اس کے سامنے اکثر بیان کیجیے اور اس سے مطالبہ کیجیے کہ دوسرے معاملات میں بھی وہ ایسا ہی بن جائے۔ اس طرح بچے کو اپنے بارے میں اصلاح کا خیال ہوگا اور وہ اپنے کردار کو سدھار سکے گا۔

دوسری بات جو اسی طرح اہم ہے وہ یہ ہے کہ بچہ کبھی ایک ساتھ اپنی تمام خامیاں دُور نہیں کر سکتا۔ بچہ کیا کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ البتہ کوشش یہ کیجیے کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی خامیوں کو دُور کرے۔ اگر اس طرح کا سدھار آپ اس میں محسوس کرتی ہیں تو مُراد پوری ہو رہی ہے۔

تیسری بات بھی کافی اہم ہے، اور وہ یہ ہے کہ کردار کی تعمیر یا سدھار ایک دن میں نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے صبر، تحمل اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے بعض اوقات

تو کسی اچھائی کو اختیار کرنے اور کسی بُرائی کو چھوڑنے میں ہینے کے ہینے لگ جاتے ہیں۔  
ہاں یہ بات بھی آپ کی توجہ کے لائق ہے کہ آپ بچے سے قطعاً یہ توقع نہ کریں کہ وہ  
ساری خوبیوں کا حامل رہے گا۔ زندگی میں وہ کبھی کوئی غلطی کرے گا ہی نہیں۔ وہ بچہ ہے اور  
تجربے کر رہا ہے، اس لیے اس سے غلطیاں بھی ہوں گی، وہ بھول چوک بھی کرے گا۔ البتہ  
آپ ان کو ہمیشہ بے انتہا اہمیت نہ دیں اور بچے کو ناقابل اصلاح نہ تصور کرنے لگ جائیں،  
بلکہ اس خامی کو بڑی خاموشی اور ہوشیاری کے ساتھ دور کر دیں۔ کیوں کہ بچہ جس قدر جلد  
ایک چیز کو اختیار کر لیتا ہے اسی قدر جلد وہ اس کو چھوڑ بھی دیا کرتا ہے۔  
اللہ تعالیٰ آپ کی اس جدوجہد کو کامیابی سے نوازے۔! آمین!

# مسلمہ کی دعائیں

مرتبہ

اُمّ صہیب

یہ حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں کی دعائیں الگ الگ نہیں ہوتیں کیوں کہ دونوں کے مقاصد ایک ہوتے ہیں اور دونوں کی آرزوؤں اور تمناؤں میں فرق نہیں ہوتا۔

لیکن

بہت سی دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو عورتوں کی زبان پر دن رات آتی رہتی ہیں۔ اُمّ صہیب نے انھیں دعاؤں کو صرف قرآن و حدیث سے انتخاب کر کے پیش کر دیا ہے۔

ہر دعا کے عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔  
انتہائی خوبصورت طباعت و تزئین

قیمت: ۵ روپے

صفحات ۶۴

# پھوٹی ہو

ابن فرید  
کا

مقبول ترین ناولٹ

ایک نوجوان لڑکی اسلام کے نظام حیات کو رہنما بنا کر اپنی سسرال کی زندگی کو اس سلیقے اور حکمت عملی کے ساتھ بدل ڈالتی ہے کہ پورا ماحول جنتِ ارضی کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اسے اگر عملی نفسیات کی مثال قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ناولٹ کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک تیس ہزار کے قریب شائع ہو چکا ہے۔ انتہائی سلیس شگفتہ اور مسحور کن انداز بیان۔

سولہواں ایڈیشن غیر معمولی ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔  
انتہائی دیدہ زیب طباعت و تزئین

قیمت: ۲۵ روپے

صفحات: ۱۲۸

## نگینے

مرتب: ابن فرید

اہلِ المؤمنین صحابیات و صالحاتِ اسلام کی زندگی کے سبق آموز اور ایمان افروز واقعات و حادثات انتہائی سادہ و سلیس زبان میں بہت اختصار کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ خواتین ان مثالی واقعات و حادثات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہیں۔  
نیا ایڈیشن غیر معمولی ترمیم و اضافہ کے ساتھ انتہائی خوبصورت لکڑی طباعت و تزئین۔  
(ذیر طبع)

# گھریلو جھگڑے

ابن فرید

گھریلو زندگی میں اکثر ایسے مواقع آتے ہیں کہ آپس میں رنجش ہو جاتی ہے کبھی پاس پڑوس والوں سے، کبھی سہیلیوں اور ملنے والیوں سے ان بن ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے

لیکن فکر مندی کی بات تب ہوتی ہے جب یہ رنجشیں اور یہ ان بن طول پکھنچ جائے۔

پھر یہ ضروری بھی تو نہیں

کہ ایسی تشویش کی صورت پیدا ہی ہو

گھریلو جھگڑے

گھریلو جھگڑوں کو نپٹانے کا ہدایت نامہ نہیں ہے

ایک ہموار و خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے اسلامی نفسیات کی روشنی میں اوسط تعلیم یافتہ خواتین کے لیے

قرآن و حدیث،

آہیات المؤمنین

اور

صحابیات و صالحاتِ اسلام کی زندگیوں سے حوالے دے کر بے حد آسان زبان میں

مشورے دیے گئے ہیں

بے حد پرکشش و دیدہ زیب طباعت و تزئین، جدید ترین ایڈیشن نئے حالات کے مطابق ترمیم و اضافہ کے ساتھ۔

(زیر طبع)

# ہم کیسے رہیں

ابن فرید

روزمرہ زندگی میں بہت سے ایسے سوالات اٹھتے ہیں جن کے جوابات نوعمر خواتین کو مطلوب ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات انتہائی سلیس و شگفتہ زبان میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی نفسیات کے مطابق دیے گئے ہیں۔

بے حد خوبصورت اور دلکش طباعت و تزئین  
جدید ترین ایڈیشن نئے حالات کے مطابق ترمیم و اضافہ کے ساتھ  
(زیر طبع)

# زندگی کا سلیقہ

ابن فرید

خواتین کے لیے آدابِ زندگی پر ایک اور اہم کتاب۔ سلیس، صاف، سادہ زبان میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی نفسیات کو اساس بنا کر پیش کیے گئے ہیں  
جدید ترین ایڈیشن

ترمیم و اضافہ کے ساتھ نئے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے  
بے حد حسین و پرکشش طباعت و تزئین

(زیر طبع)

## ابن فرید کی

چند اہم علمی و ادبی تصنیفات

یہ جہاں اور ہے

دس طویل افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ صالح و مثبت نظریہ حیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ فنی و تکنیکی لحاظ سے ہر افسانہ معیاری و منفرد ہے۔ انتہائی خوبصورت و دلکش طباعت و تزئین۔  
صفحات: ۲۷۲ قیمت مجلد: ۹۰ روپے

### میں کا تعاقب

۲۴ مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ ابن فرید اپنے کرداروں کے باطن میں بہت گہرائیوں تک اتر جاتے ہیں اور افسانوی کینوس میں ایسی تہہ داری پیدا کرتے ہیں کہ ان کہانیوں کو بھوننا ممکن نہیں ہوتا۔ ہر افسانہ صالح و مثبت نظریہ حیات کی نمائندگی کرتا ہے۔  
انتہائی خوبصورت و دلکش طباعت و تزئین (زیر طبع)

### میں اہم اور ادب

تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ صفحات: ۲۲۸ قیمت مجلد: ۲۰ روپے

### چہرہ پس چہرہ

تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ صفحات: ۱۸۰ قیمت مجلد: ۲۵ روپے

### صوابدید تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ (زیر طبع)

ابن فرید بحیثیت نقاد اردو ادب میں اپنا ایک منفرد و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے مقالات بین الملومی مطالعہ اور مثبت تعمیری فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

### ادب : داد طلب

ابن فرید کی وہ تمام تحریریں جو مقالات، اصول و نظریات، مسائل و معارف، محاضرات و مصاحبات، مباحث و آراء کی شکل میں اسلامی ادب سے متعلق شائع ہوئی ہیں انہیں اس مجموعہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ایک حوالہ کی کتاب بن گئی ہے۔ دیدہ زیب و دلکش طباعت و تزئین۔  
(زیر طبع)

# منشورہ بیت الصالح

معیاری کتابیں  
معیاری طباعت و تزئین  
معقول قیمت

ہمارا مطمح نظر  
ہمارا امتیاز

ہماری صرف چند مطبوعات ہی نے ہمارے دعوے سے زیادہ  
ہمارے امتیاز کا اعتراف کر لیا ہے

آپ بھی توجہ فرمائیں





کتاب ابن فرید صاحب نے بچوں کی تربیت پر لکھی ہے اور اس میں مخاطب تمام تر ماؤں کو رکھا ہے۔ کتاب واقفی ماؤں کے لیے بڑے کام کی ہے۔ شروع میں ایک لمبی فہرست عنوانات درج ہے مثلاً ایک عنوان ہے ”بچے کے ابتدائی سال“۔ اس میں جسمانی صحت اور ذہنی صحت وغیرہ کا مفصل تذکرہ ہے یا ایک اور عنوان ہے ”بچے کی تربیت کے لیے بنیادی باتیں“ اس کے اندر بچے کی جذباتی نشوونما، بول چال کی نشوونما وغیرہ ساری چیزیں آگئی ہیں۔ کتاب کی زبان بھی عام فہم اور سلیس ہے، کتاب دیدہ وری اور جامعیت سے لکھی گئی ہے اور سب بچوں والے گھروں میں رکھنے کے قابل ہے۔ مسلمان والدین کو اس سے بچوں کی تربیت میں بہت اچھی مدد ملے گی۔ . . . . بچوں کے لیے ذہنی و جسمانی نشوونما کے ساتھ بڑا اہتمام ان کی دینی و اخلاقی تربیت کا بھی رکھا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی

صدق جدید - ۲۱ دسمبر ۱۹۵۶ء

